سرودِ غالب

سرودِ غالب

مرتبہ

یوسف بخاری دہلوی

شیخ مبارک علی تاجر و ناشر کتب

اندرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

سرودِ غالب

یوسف بخاری
(دہلوی)

خاتمہ اور روشنی

مرتضیٰ حسین فاضل
(لکھنوی)

سلسلہ مطبوعات	۱۸۲
نام کتاب	سرودِ غالب
مرتب	یوسف بخاری دہلوی
خاتمہ اور روشنی	مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
ناشر	احمد علی شیخ (مالک و مہتمم ادارہ)
اشاعت اوّل	فروری ۱۹۶۸ء
مطبع	علمی پرنٹنگ پریس لاہور
زیر نگرانی	شیخ نیاز احمد صاحب
تعداد	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
قیمت	سفید کاغذ -/۱۲
	رف کاغذ -/۹

ملنے کا پتہ :-

شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب

اندرون لوہاری دروازہ، لاہور

(پاکستان)

فہرست

مقدّمہ

ہے آدمی بجائے خود اِک محشرِ خیال

فاضل لکھنوی

اکبرِ اعظم نے لاہور اور آگرے کی بستیوں کو عظیم شہروں میں بدل دیا تھا۔ یہ عظمت علم و فن کے رنگ و روغن سے عبارت تھی۔ یہاں محمود غزنوی کے دربار کا نقشِ ثانی تیار کیا گیا۔ بڑے بڑے معمار، اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے فنکار جمع کیے گئے۔ موسیقار، نقاش، سنگ تراش اور شاعر، نثر نگار اور مورّخ آئے۔ سیاست داں، جنگ آزمودہ سپاہی اور جرنیل، جغرافیہ داں اور محاسب، مذاہب کے علماء اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے سیّاح و تاجر، حکیم اور فلسفہ سب ہی تو تھے۔ ان میں قد آور شخصیتیں اور معیاری فنکار قطار اندر قطار دکھائی دینے لگے۔ آگرہ سے کشمیر تک بہار آفریں ہوائیں اور نغمہ سنج صدائیں تھیں۔ سپاہی کو تلوار اور ادیب کو قلم استعمال کرنے پر داد بھی ملتی تھی اور صلہ بھی، القاب و خطاب بھی حاصل ہوتے تھے اور جاگیر و منصب بھی۔ اکبر نے آئین و سیرہ کی جو داغ بیل ڈالی تھی وہ جہانگیر و شاہجہاں کے عہد تک قائم رہی۔ فن کی قدر تھی اور فنکار کی عزّت، اپنی اپنی جگہ جو احترام سپاہی کا تھا وہی عالم کا، جو مرتبہ عالم کا تھا وہی عزّت شاعر کی۔ دونوں بادشاہوں کے گُن گاتے اور دھن پاتے تھے۔

عالمگیر کے زمانے میں یہ شاہی باغات کے پودے بڑھ کر اتنے تناور ہو گئے تھے کہ انہیں شاہی توجہات سے بے نیازی حاصل ہو گئی۔ ادب کی قدردانی درباری افراد کی سطح سے اُتر کر معاشرے کی ہیئت مجموعی میں داخل ہو گئی۔ شعر و ادب کی نئی قدروں نے قدامت، روایت، تاریخ و تہذیب کو مکمل طور پر اپنا لیا۔ شاہ عالم ثانی سے اکبر ثانی تک جو طوفان اُٹھے اور سیلاب آئے وہ جاگیریں لے ڈوبے، سپاہیانہ جذبے بہا لے گئے، مُدبّروں

اور ماہروں کو ڈبو گئے۔ بہادر شاہ ظفر کا دَور تو کسی بڑے سمندر میں ایک اُونچے سے ٹاپو کے مانند تھا۔ لوگ طوفان کے ہاتھوں ڈوبنے والی کشتی سے پانی میں گرے۔ کچھ ڈوب گئے۔ کچھ اس ٹاپو میں پہنچ کر آسودہ ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر کچھ دن اور زندہ رہے اور ادھر سے گذرنے والوں نے دُور ہی سے سہی اُنہیں دیکھ لیا تو یہ کشتی سواروں کو راستے کی مشکلوں سے نئی راہوں سے اور آنے والی منزلوں سے باخبر کر دیں گے۔ اور اگر مرنا ہی بدا ہے تو خشکی اور پانی کے دونوں ویرانے برابر ہیں۔ نہ مزار کی فکر نہ نشان کی اُمید۔

آخری تین سو سال میں شاہی کے زیر سایہ زندگی نے ایک پگڈنڈی بنالی تھی۔ زرق برق زندگی پھر سُست رفتار اور منجمد لمحات بسر کرنے کا نام تھا حیات۔ کچھ آداب و رسوم، کچھ قیود و قواعد زمین ہو، جاگیر ہو، تنخواہ ہو، عُہدہ ہو، دربار میں نام ہو، بادشاہ کو نذر دینا واجب ہے خواہ پانچ روپے اور ایک اشرفی ہی ہو اور شاگرد سے مٹھائی لی جائے گی خواہ وہ قرضدار ہو جائے۔ ایک بڑی وسیع ڈیوڑھی دار محل سرا، زنان خانہ اور مردان خانہ ہو۔ بیٹھک میں دو چار داستان گو، ایک دو مصاحب شاعر اور نجومی بیٹھے ہوں۔ ساقی و مطرب، معشوق و شراب ہو۔ مشاعرے ہوں، دولت کے مظاہرے ہوں، مذہب کی پاسداری بھی ہو اور عام نگاہوں سے ذرا ہٹ کر گناہ بھی کر لیے جائیں۔ ایک خوبصورت، اعلیٰ درجے کی طوائف سے راہ و رسم بھی ہو۔ اور بیٹھک میں تاش، گنجفہ، چوسر، پچیسی بھی ہوتی رہے۔ دو چار جواری ہر وقت حاضر ہوں۔ یہ تھے دل کے بہلاوے اور ٹوٹی ہوئی نوابی یا جاگیرداری کی بالکل آخری نشانیاں، جیسے دلّی کا ہر اُونچا آدمی بڑائی کا لازمہ سمجھتا تھا۔ ہر ایک کی تمنا تھی کہ دربار میں اُس کا آنا جانا ہو۔ دربار کے حاضر باشوں کی خواہش تھی کہ خزانہ سے کچھ وظیفہ ہو۔ وظیفہ دار خطاب اور منصب کے متمنی ہوتے تھے۔

منصب کیا تھا؟ عرض بیگی، ناظم، بیوتات، وزیر اعظم یعنی امیر الامراء، بخشی، حکیم۔ کام کسی کا کچھ نہ تھا۔ ہاں مغل دربار کے سہارے نام پانے کا ایک اچھا ذریعہ تھا۔ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ آمدنی بھی ہو جاتی تھی۔ مشاہرہ ہوا تو ہزار دو ہزار سے پانچ روپے تک، جاگیر ملی تو دس بیس ہزار

تنگ کی۔ آخر بہادر شاہ کی آمدنی ہی کیا تھی؟ لاکھ سوا لاکھ روپے ماہوار تنخواہ، کچھ املاک خالصہ کی آمدنی بھی رکھ لیجیے، تین چار لاکھ روپے کا خرچ، بہت ہاتھ کھینچ کے رکھا، جب بھی کچھ نہ کچھ قرض لینا پڑتا تھا۔ پھر اس قرض کی ادائیگی کے لیے رزیڈنٹ اور گورنر جنرل کی منت خوشامد کی۔ کسی حق سے دست بردار ہونے کی دستاویز پر دستخط کیے تو تھوڑی بہت رقم مل گئی۔

اب اندازہ کیجیے کہ غالب کا معاشرتی اور معاشی ماحول کیا تھا اور اس ماحول میں غالب کا درجہ کیا ہو سکتا تھا؟ اُن کے والد جاگیردار نہ تھے، اُن کے دادا مغل دربار کے امیروں میں نہ تھے۔ وہ خود دلّی کے شہزادوں، نواب زادوں، قاضی زادوں اور علماء کے خاندان سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ بلکہ دلّی تو اُن کی زاد بوم بھی نہ تھی۔ آگرے میں رہے سہے۔ شادی بھی ایسے خاندان میں ہوئی جو خالص دہلوی نہ تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ باپ اور چچا کی زمین و تنخواہ و اعزاز سے محروم سے قرار پائے۔ انگریزوں کی پنشن دلّی والوں کے نزدیک قلعے کے پانچ روپے کا بھی مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ اُدھر غالب بنحیال خود غلام حسین خاں کمیدان کے نواسے، نصر اللہ بیگ خاں صوبہ دار آگرہ و منصبدار کمپنی بہادر کے بھتیجے اور مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے داماد تھے۔ اُنہیں اپنا رکھ رکھاؤ بنانے اور وقار بڑھانے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑی۔ ان کی دولت مندی اور علمیت اتنی نہ تھی کہ وہ اپنے معاصرین میں ممتاز درجہ حاصل کرتے۔ لہٰذا گھر کا اثاثہ بیچا، اُونچی صحبت میں بیٹھے، کمپنی سے ملنے والی پنشن کو بنیاد قرار دیا۔ انگریزوں کے درباروں سے خلعت حاصل کیے اور مطالبہ کیا کہ اُنہیں لندن سے ملک الشعرائی جیسا کوئی خطاب مل جائے۔ جوانی کے آغاز ہی سے احساسِ کمتری نے شعلہ کی صورت اختیار کر لی۔ اس جذبے کو دبانے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے اُنہوں نے دشت قبچاق کے قبیلوں سے رشتے کا اعلان کیا۔ ماوراء النہر کے ناموروں اور اُن کے امیروں سے شجرے ملائے۔ حد یہ ہے کہ تیمور و چنگیز و افراسیاب تک پہنچے۔ جب نسب نامہ کے سہارے کچھ انا کو تسکین ہوئی تو حکمران قوم کی دوستی اُن کے ساتھ بادہ نوشی کر کے شہر کے باوقار امیروں کی پہلو نشینی کو اس پر مستزاد کیا۔ وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹ قائم کر کے بجائے خود امیر ہو گئے اور

دلی کے ایک حلقے میں تھوڑا بہت منفرد انداز کا وقار قائم کر لیا۔ خاص قسم کا ولایتی لباس، ویسی ہی کشیدہ قامتی اور خدوخال، وضع قطع، امارت آمیز سپاہیانہ اخلاق وعادات۔ ذرا خود دارانہ میل جول، اپنی انفرادیت کا خیال، اپنی جدت پسندی اور بلند خیالی سے مرکب ایک شخصیت بنا لی۔ مگر ابھی تک "مرزا نوشہ" ہی کہے جاتے تھے۔ یہ بات اُن کے لیے سوہانِ رُوح تھی، وہ یہ نام سُن کر چیخ اُٹھتے تھے۔

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

بچپنے میں اور بُری عادتوں کے ساتھ ساتھ شاعری کا چسکا بھی لگ گیا تھا۔ بیس بائیس برس کی عمر تک فارسی کے محبوب اور برِصغیر کے نامور شاعر مرزا بیدل کے رنگ میں کچھ غزلیں بھی کہہ لیں تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر میں نے اس رنگ میں مقبولیت حاصل کر لی تو اُونچے حلقوں میں اور علمی محفلوں میں میرا سکہ بیٹھ جائے گا۔ مگر اُن کا ریختہ رشکِ فارسی نہ مانا گیا، اس لیے اُردو چھوڑ کر فارسی کی طرف آئے، اور اسد سے غالب بنے۔ یہ تبدیلی شعر کی حد تک بڑی خوشگوار تھی، اُنہوں نے فارسی شاعری کے لیے بیدل کے بجائے عُرفی کو خضرِ راہ بنایا — عُرفی اور غالب میں نفسیاتی مماثلت بھی تھی، اس کو بھی حریفوں کے برابر سمجھنے والے کم تھے، سرکار دربار میں اس کا اعزاز بھی کچھ نہ تھا۔ اس کے ساتھی منصبدار تھے اور وہ غریب شہر ایک ایک کو حسرت سے دیکھتا تھا۔ لیکن اُس کی بات سُننے والے داد دینے کے بجائے بیداد کرتے تھے۔

غالب بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار رہا — عُرفی کی رشک شوئی خاں خاناں نے کی۔ غالب کو آخر میں بہادر شاہ ظفر مِل گئے۔ عُرفی کی جواں مرگی نے اس کا بھرم رکھ لیا، غالب کی جوانی ناکامیوں کا شکار ہوئی اور بڑھاپے میں اُسے ان لوگوں کی مدح کرنا پڑی جو اس کی خودداری کے قائل تھے، مگر وہ خود اُن کی دست گیری کا ممنون اور ان کے احسان کا

شکر گزار تھا۔

غالب سمرقند، بخارا، قبچاق، ماوراالنہر کے اُن سخت کوش اور جفاکش، حوصلہ مند و شجاع خاندانوں کا چشم و چراغ تھا جو پہاڑوں کی چٹانوں سے ٹکر لینا کھیل سمجھتے تھے۔ جنھیں تلواروں اور بازوؤں کے کس بل پر فخر تھا۔ اُس کے باپ، دادا، چچا اور نانا سپاہی تھے۔ وہ خود بھی سپاہی منش تھا۔ لیکن ماحول نے نواب بنا دیا تھا۔ وہ نوابی میں بھی بانکپن برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ حالات کی ناسازگاری نے یہ بھی نہ ہونے دیا۔ اب ایک ہی مفر تھی اور وہ خداداد ملکہ ادب و شعر گوئی تھا۔ یعنی ظاہر کو باطن اور باطن کو ظاہر میں بدل دینے کے لیے قلم و زبان کی ورزش — اسی ملکے نے اُسے سب سے بڑی انفرادیت اور طویل زندگی عطا کی۔

غالب، لاوارث فرزند، ناکام و زخم خوردہ جوان، مایوس و حسرت زدہ بوڑھا تھا۔ باپ کی محبتوں سے محروم، چچا کی نوازشوں سے محروم، دولت سے محروم، علمی اعزازات سے محروم — کوشش کی تھی کہ چچا کے بعد خزانۂ کمپنی بہادر سے براہِ راست پنشن ملے ناکامی ہوئی۔ چچا کے بعد جو پنشن ان لوگوں کے لیے مقرر ہوئی تھی اس کی رقم دس ہزار سالانہ ہو، ناکامی ہوئی۔ لکھنؤ میں شاہی دربار پذیرائی کرے نہ ہو سکی۔ کلکتہ میں انگریز کوئی ادبی اعزاز یا ایوارڈ دلا دیں، ممکن نہ ہوا۔ ان ناکام کوششوں سے شماتت ہمسایہ میں اضافہ ہو گیا۔ سرمایہ ایک تو پہلے ہی کچھ نہ تھا اب مزید زیر باری ہو گئی۔ نالشیں ہوئیں اور قرضخواہوں نے حسرتیں پوری کر لیں لوازم امارت میں ایک بات باعثِ رونق کا شانہ تھی (شطرنج، پچیسی، تاش، گنجفہ) اس کا خمیازہ یہ بھگتنا پڑا کہ سزا ملی، جرمانہ ہوا، اخباروں کے ذریعے پورے ملک میں بدنامی مگر نسلی خصوصیات اور مزاج کی اُفتاد نے سہارا دیا۔ یاس کو شکست ہوئی اور غالب بہ حیثیت:

نجم الدولہ، دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ

کے لقب سے ملقب ہو گئے۔ گویا اب ادبی طور پر اُنھیں ابوالفضل کا مرتبہ ملا اور تاریخ دولتِ تیموریاں لکھنے کا منصب ملا۔ چھ پارچے کا خلعت مع تین رقم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ

و حمائل مروارید عطا کیا گیا۔ پچاس روپے ماہوار تنخواہ منظور ہوئی۔ اور کچھ دن بعد ولی عہد پھر بادشاہ کی اُستادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

اس پس منظر میں غالب کے ذہن اور فن نے نشو و نما پائی۔ مشکلات میں دن گذارنا اور مایوسیوں میں مسکرانا، غموں میں ہنسنا، کش مکش حیات سے مفاہمت آزار پسندی، مصائب کا خیر مقدم کرنے کی جُرأت نے غالب کو ذہنی پھیلاؤ عطا کیا۔ ان کے اظہار میں تیکھا پن اور ابلاغ میں تاثیر کی بدولت فنی برتری ملی۔ بلند ہمتی اور سپاہیانہ طبیعت نے اُنہیں شکست ماننے پر کبھی تیار نہ ہونے دیا۔ زمانے نے اُنہیں جب گرایا وہ نئے تیور لے کر اُٹھے، اسی تیور کو کبھی تصوف کا نام دیا جاتا ہے ــــ غالب کا تصوف۔ کبھی ــــ خودداری اور انا سے تعبیر کرتے ہیں۔ اِسی زور دراں ہمتی کو طنز کا پیرایہ میں سمجھایا جاتا ہے اور اسی کا نام فلسفۂ حیات رکھا گیا ہے۔ اِسی کشاکش ظاہر و باطن نے غالب کو آفاقیت بخشی اور اسی وسعت تجربہ نے غالب کے مشاہدہ میں گہرائی اور بیان میں گیرائی پیدا کی۔ اُنہوں نے حسرتوں کو مسرتوں کا لباس عطا کیا اور موت کو زندگی، کانٹوں کو پھول، تشنگی کو سیرابی، ذرہ کو صحرا، چنگاری کو شعلہ، قطرہ کو دریا مان کر آسودگی حاصل کرلی۔ غالب کی یہی آسودگی تو مزدور، ستم رسیدہ، پریشان ذہن اور زندگی سے تنگ آنے والے عاشق و بوالہوس، مفکر و ادیب، فلسفی و سائنسدان کو سکون بخشتی ہے اس کی ذہنی اُلجھنوں کا مُداوا کرتی ہے، اور ہر شخص دیوان غالب پڑھ کر ایک لطف و مسرت کرتا ہے۔ یہ سکون آفرینی غالب کا فن ہے۔ جذباتی کیفیتوں کی عکاسی، ذہنی تاثرات سے مثبت نتائج کا استخراج، اپنے دل کی بات اس طرح کہنا کہ دوسرا یہ سمجھے کہ دراصل یہ اسی کے خیالات کا بیان ہے۔

غالب کا ذہن امیرانہ افکار کا خزانہ ہے۔ اس کا دل بہادرانہ جذبات سے لبریز ہے امیرانہ فکر کا تقاضا ہے کہ دولتِ دو عالم ملے تو آسودہ نہ ہو۔ شجاعانہ جذبہ چاہتا ہے کہ زیر دست و اُفتادہ، عاجز و بے نوا کی جتنی بھی مدد کی جائے کم ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ :

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے کہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ بحث کہ تکرار کیا کریں

امیر دولت کے سہارے عزت چاہتا ہے، بہادر کردار کے ذریعہ ناموری کی تمنا کرتا ہے:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

دولت مندی و سرمایہ داری سے جمود اور فکری ٹھہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ سطحیت اور سہل پسندی ہے۔ غربت و ناکامی مسلسل جدوجہد کی دعوت دیتی ہے۔ اگر آدمی بلند حوصلہ ہو تو اُسے صحرائے جستجو میں منزلیں نہ ملنے سے نئے نشان نصب کرنے اور نئی منزلیں بنانے کا موقعہ ملتا ہے۔ غالب اپنی خوش نصیبوں کا پیش رَو ہے، وہ پہلے منزل در رہنما کی تلاش میں نکلا:

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

پھر اُسے ایک ناگوار واقعہ پیش آیا۔ بے وفائی، گمراہی اور نفسانفسی کے شکار ہونے والے رہنما دیکھ کر اُس نے اعلان کیا:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اَب کسے رہنما کرے کوئی

اب تجربہ نے غالب کو نکھارا، جیسے سونا تپ کر کندن بن جائے۔ اسی طرح غالب کی شخصیت اُبھری اور اس نے انفرادیت کو نمایاں کیا:

لازم ہے کیا کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

سفرِ بے حضر، بیابان بے منزل کو دیکھ کر ایک خیال آیا اور یہی خیال زندگی بنیاد ہے ——— خیال یہ ہے کہ آخر سفر خود بھی تو ایک مقصد ہے۔ حرکت اور گردش زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ناکامی مسلسل بھی تو ایک کامیابی ہے۔ منزلوں کو سراب اور سراب کو وہم سمجھنے کا تجربہ اور مشاہدہ زندگی کی اُلجھنوں کا دریافت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ اس لیے:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

خلق کی روشناسی کے لیے مجنوں کی صحرا نوردی، فرہاد کی کوہ کنی، منصور کی سُولی اور ایوب کا صبر، یعقوب کا گریہ درکار ہے۔ جب تک دربدر کی ٹھوکریں اور نشیب و فراز کا مشاہدہ اور سرد و گرم روزگار کا تجربہ ہو اُس وقت دُنیا کسی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی۔ بصیرت و تجربہ کی وسعتیں آدمی کو آدمی اور انسان کو انسان بناتی ہیں۔ ہر آدمی انسان نہیں بناکرتا ——— غالب ایک منزل آگے بڑھا۔

اِن آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

رنج سے خُوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

کوئی میرے دل سے پُوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا،

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

~~~

اور اس غمِ عشق یا غمِ روزگار نے یہ حوصلہ بخشا کہ:
~~~

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم !
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
کیا غم خوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

تابِ غم نے جگرداری بخشی، جگرداری نے فکرِ سُود وزیاں سے بلند تر کر دیا، وسعتِ ظرف اور فروغِ نظر عطا کیا:

دل ہر قطرہ ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پُوچھنا کیا
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصُور نہیں
جز نام نہیں صُورتِ عالم مجھے منظُور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

ساحل کا یہ پھیلاؤ، کشت زار و میدان سے ہوتا ہوا، خیال و تصوّرات کی پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔ گمشدگی کا یہ پہلو دوسروں کو جستجو کے لیے آمادہ کرتا ہے اور سلسلۂ فکر و نظر، جد و جہد، علم و عمل کا آغاز ہوتا ہے:

مستانہ طے کروں ہُوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدّعا نہ مانگ
ہنگامۂ زبونیِ ہمّت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو،
ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب!
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا، پایا

زندگی جدّت پسندی، نئی قدروں کو للکارنے کا تیور، پیغامِ انقلاب آفرین، آسودگی سے ڈرانے اور لاشعور کو شعور میں بدل دینے کی تعلیم ہے:

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے ذوقِ قدم میرا
یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق، بادۂ صبر آزما مجھے
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی
ہے تنگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہ ہو

دیوانِ غالب پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اس دفترِ شعر و سخن میں" وراثے شاعری، فکر و نظر کی فراوانی ہی اس کی محبوبیت کا راز ہے۔ حقائق شناسی، نکتوں کا پھیلاؤ، تجربوں کی توسیع، اصول کا اطلاق، برتری کا عرفان، توانائی کی قیمت کا تعین، رزم گاہِ حیات میں جنگ آزمائی کی ترغیب،

متسلل انقلاب وحرکت کی طرف توجہ کا انعطاف، حسرت کو مسرت سمجھنے کا میلان، فریب ہستی کا انکشاف، حلقہ دام خیال کے پھیلاؤ کا حال، عشق و زندگی کا ربط، اشک و رشک، موت وحیات، رفتار و پرواز، جنون و تماشا، جلوہ ونقش کا ایک عالم ہے۔ صحرا کی وسعت، دریا کا گہراؤ، سیلاب کا زور، آفتاب کی حرارت، آئینہ خانے کی حیرت آفرینی، بہار وخزاں کے فکر انگیز نکات و رموز کا گنجینۂ بے بہا ہے۔ لوگوں نے اس کان جواہر سے یاقوت والماس، ہیرا اور پنا، زمرد اور پکھراج، نیلم اور بلور، فیروزہ اور عقیق الگ الگ کرکے جواہر خانے بنائے ہیں۔

ظہیر الدین علوی نے "اشک و رشک" کے نام سے ایک کتابچہ چھپا یا تو خیال کو مہمیز ملی۔ اور میں نے اپنی بیاض انتخاب غالب کا نام "نقش ہائے رنگ رنگ" اور "آئینہ خانہ" رکھا۔ خورشید الاسلام نے "غالب" ۔ ابتدائی دور میں ایک ضمیمہ لکھا۔ اس ضمیمہ میں غالب کے ابتدائی اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرزا نے ابتدائی شاعری میں کون کون سے الفاظ اور اُن کے تلازمے بار بار استعمال کیے ہیں چنانچہ اس مقصد کے لیے :

"رفتار" پر سات — "دریا" پر تیرہ — "موج" پر تیرہ — "پرواز" پر سات — "شوق" پر ستر — "جوش" پر چھ — "جنوں" پر پندرہ — "تمنا" پر سولہ — "سعی" کے ذیل میں تین — "تماشا" کے عنوان سے سولہ — "جلوہ" بائیس — "نقش" کے عنوان سے گیارہ — بزم پر گیارہ — "سیلاب" پر چار — "بیاباں" سے مربوط سات شعر — "دشت وصحرا" بارہ — "ویرانی" آٹھ — "آئینہ" اُنچاس — "شمع" تین — "شعلہ" پندرہ — "برق" سات — "آتش" سات — "شرار" چھ — "چراغ" پر چار — "دود" چار — "تپش" دس — "گداز" چار — "بیتابی" پانچ — اور

"کشاکش" پردۂ شعر تین مصرعے، اس طرح دوسرے عناوین کے ذیل میں بھی کچھ مصرعے نقل کیے ہیں۔

خورشید الاسلام صاحب نے غالب کے لفظی تلازموں کے استعمال سے متعلق ذہنی رجحان کا سُراغ لگایا ہے۔ پروفیسر ظہیر الدّین صاحب نے معنوی خوبیوں اور خیال کی پہلوداری کو سامنے رکھا ہے۔ "سُرودِ غالب" اسی قسم کی ذرا متنوّع پیش کش ہے، آپ اس کتاب کو دیوانِ غالب کی شعری تہذیب بھی کہہ سکتے ہیں اور فنّی تجزیہ کا ایک تحلیلی تجربہ بھی۔ فاضل مولّف نے اس تجزیہ اور تجربہ کے نتائج تحریر کرنے سے پہلوتہی کی ہے۔ اُن کے خیال میں اس عمل کے نتائج قلمبند کرنے سے دوسروں کے حق پر قبضہ ہوجائے گا۔ ممکن ہے کوئی فلسفی اس عمل سے فلسفیانہ مسائل کا استخراج کرے۔ اور نفسیات کا عالم نفسیاتی مباحث میں امداد حاصل کرے۔ شاعر کو شعری فوائد کا خیال آئے اور نقّاد کو اس کے کام کا مواد مل جائے۔ فرد و معاشرہ پر کام کرنے والے اس سلسلے کے معاملات تلاش کریں۔ اور ذہنی قوتوں کو ناپنے والے اپنے پیمانوں سے کام لیں۔

غالب کے عاشق غالب کے خدوخال دریافت کریں۔ اور اُردو ادب کی وسعتوں کا جائزہ لینے والے زبان و بیان کے پیرایوں پر کام کرنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ کریں۔ اِسی وجہ سے میں نے ہر مجموعہ شعر کے نیچے اپنے لکھے ہوئے نوٹ حذف کر دیے جس کا مجھے افسوس تو ہے مگر کتاب کے مزاج میں دخل دینا بھی گوارا نہ ہوا، اگرچہ محترم مولّف کی طرف سے اجازت مل چکی تھی۔

۱۷ ارجون ۱۹۴۹ء جمعہ ۱۹ ارجمادی الاوّل ۱۳۶۸ھ کو مَیں نے اس قسم کا مطالعہ قلمبند کر لیا تھا لیکن اس پر نظر ثانی اور ترتیب کا کام باقی تھا۔ اس کے بعد اُردو مکاتیب غالب میں اُلجھ گیا، عودِ ہندی کی ترتیب سے فارغ ہوا تو کلّیاتِ فارسی کا کام شروع کر دیا۔ اس سے چھُٹی ملی تو اُردو دیوان کے متعلق زیرِ قلم ہے۔ دو ایک مضمون لکھے تھے۔ مثلاً غالب اور آئینہ

"غالب اور مرثیہ"۔ یہ مضمون چھپے اور بس!

سُرودِ غالب میں چند صفحات میں نے اپنی سابقہ محنت کے شریک کیے ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایسے عناوین اور بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

سُرودِ غالب جسے مَیں "محشرِ خیال" کہتا ہوں، ایک بڑا ذخیرۂ جستجو ہے۔ اس فانوسِ رنگا رنگ سے اگر فروغِ نظر حاصل ہو جائے تو محنت کام آ گئی۔

جناب شیخ مُبارک علی صاحب کو غالب سے عشق ہے۔ "دیوان غالب" بر جناب چغتائی کے نقشِ اوّل و ثانی کو اُنہوں نے بڑی قدردانی کے ہاتھوں سے لیا اور اربابِ ذوق تک پہنچایا۔ اور "صد سالہ برسی" کے موقعہ پر پھر پُورا ایڈیشن حاصل کر لیا ہے۔ اُنہوں نے احمد علی سلّمہٗ کو اِس ناقدری کے باوجود کلّیاتِ فارسی چھاپنے کا حکم دیا جو اپنے روایتی انداز میں شائع ہوا۔ "سُرودِ غالب" بھی شیخ صاحب مدظلّہ کی نگاہ انتخاب میں قابل قدر ہے اور ہر صاحب ذوق جناب یوسف بخاری کی محنت کو قابلِ داد سمجھے گا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور ادبی پیش کش اور غالب کے دیوان اُردو کی شرح چھاپی ہے اور وہ ہے جناب شاداں بلگرامی مرحوم کی کاوش تحقیق و نظر۔

مجھے یقین ہے کہ محبّی و عزیزی احمد علی شیخ سلّمہٗ کی یہ کوششیں ادبی حلقوں میں گراں ارز قرار پائیں گی +

خاکسار
مرتضیٰ حسین فاضل
۲۰ ستمبر ۱۹۶۷ء

محشرستانِ خیال

سرودِ غالب

مرتبہ

سید یوسف بخاری دہلوی

حرفے چند

اُردو زبان کے عظیم ترین اور زندہ جاوید شاعر مرزا غالب کے کلام پر متعدد شرحیں، بے شمار تنقیدیں اور اُن کی سیرت و سوانح پر اَن گنت مقالات تحریر ہو چکے ہیں۔ ہر چیز بار ہا گفتگو یا بحث و تمحیص کا موضوع بن چکی ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ ان لگے ہوئے نوالوں کو پھر لقمہ بنانا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آخر اس کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے فائدہ! لیکن بقول غالب ؏

ہے آدمی بجائے خُود اِک محشرِ خیال

انسان کا دماغ درحقیقت تصوّرات کی ایک آماجگاہ ہے اور تصورِ حُسن بجائے خُود ایک حُسن ہے۔ اگر سلامتِ فکر حاصل ہو تو کوئی نہ کوئی حسین خیال سُوجھ ہی جاتا ہے، اور پھر دل و دماغ کی محویت اِس خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا رنگ پیدا کر کے اُسے اور بھی نکھار دیتی ہے۔

قدرت نے غالب کو ایک ذہنِ رسا عطا کیا تھا۔ اُس کے افکارِ ذہنی کسی طرح بھی ایک محشرِ خیال سے کم نہ تھے۔ شعر کے اور لوازم و خصوصیات کے علاوہ غالب کے کلام میں عمقِ جذبات کے ساتھ ساتھ تنوعِ خیال کی جو کیفیت نظر آتی ہے، اُس کی مثال کہیں اور مِلنا اگر محال نہیں تو دُشوار ضرور ہے۔ "سَمُودِ غالب" میں اسی تنوع اور پرتوِ نقشِ خیال کو واضح کیا گیا ہے۔

اِس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ متداول دیوان کے جملہ اشعار کو اُن کے مرکزی خیال

کے مطابق ایسے جامع عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے جو قرین قیاس اور ممکن ہو سکتے ہیں
یوں سمجھیے کہ اس لالہ زار کے گلہائے رنگا رنگ کی جدا جدا تختہ بندی کی گئی ہے جو بلا امتیازِ
رنگ و بو ہر سمت اور ہر گوشے میں کھلے ہوئے ہیں۔ جس دیدہ ور کو نرگس کی تلاش ہو، وہ
تختۂ نرگس میں چلا جائے، جو گُلِ آب کا تشنہ ہو وہ تختۂ گُل میں پہنچ کر سیراب ہو جائے،
چشمِ میگوں چاہے تو سایۂ تاک میں موجِ شراب سے مخمور ہو سکتی ہے، کوئی افسردہ
دل ہے تو کنول کو دیکھے، شبِ وعدہ ہے، معلوم نہیں وہ ابھی آئیں گے یا کچھ دیر میں!
وہ کسی وقت بھی آئیں، پنبۂ بالش اور بسترِ ناز کے لیے موتیا بھی پھولی ہوئی ہے اور سمن
کی کلیاں بھی بے کل ہیں، نغمۂ گُل بھی ہے اور نالۂ عندلیب بھی۔

الغرض شعر و سخن کے اس چمن میں حُسن و جمال، محبت و عشق، عشوہ و ناز، رشک و
رقابت، تمنا و حسرت، سوزِ غم، ہجر و فراق، سودا و جنوں، نغمۂ اشک، ذوقِ لذتِ
آزار، ناکامی و محرومی، شکوۂ فلک، شکوۂ دُنیا، خودداری و خود شناسی، وجود و عدم،
عرفان و توحید، درسِ فنا، تقدیر و تدبیر، ذوقِ معصیت، پند و موعظت اور مدح و
منقبت ذرا دیکھیے تو سہی کیا کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟

کیا مستیاں چمن میں ہیں جوشِ بہار سے
ہر شاخِ گُل ہے ہاتھ میں ساغر لیے ہوئے

مُشتے نمونہ یہ چند اور دیگر وہ تمام عنوانات جو سرودِ غالبؔ کی زینت ہیں،
غالبؔ کے خاص موضوعاتِ سخن ہیں۔ ہر صاحبِ ذوق اپنے فکر و شوق کے مُطابق
اپنا پسندیدہ موضوع، موضوع کے لحاظ سے عنوان اور عنوان کے ماتحت غالبؔ کے
تخیل کی رنگ آرائیاں اور طلسم کُشائیاں دیکھ سکتا ہے۔ کوہ کندنی کے بعد صرف یہی ایک
پرکاہ ہاتھ آیا ہے۔

راقم نے جو عنوانات قائم کیے ہیں، اُن سے یہ مقصد و منشا نہیں ہے کہ

وہ اپنے متعلقہ اشعار کی کوئی اجمالی یا مختصر شرح ہیں۔ البتہ اس عمل میں صرف اتنا فائدہ مُضمر ہے
کہ ناظرِ غالب اشعار کے معانی و مطالب کی جستجو میں اپنے توسنِ فکر و خیال کو ادھر اُدھر
جولاں کرنے کے بجائے عنوان کی روشنی میں حتی الوسع ایک مخصوص سمت کی طرف تیز کرے
گا جو اُسے منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

اِس ترتیبِ نَو کے دوران میں میرا ارادہ تھا کہ آخر میں مشکل الفاظ یا تراکیب الفاظ کو بھی
ایک فرہنگ کی صورت میں پیش کر دوں، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ قدیم و جدید متعدد شرحوں کے
باوجود مشکلات و نکاتِ غالب ہنوز زیرِ بحث ہیں۔ فرہنگ کے جواز کو غیر ضروری سمجھا میرا
خیال ہے کہ عنوانات کی اختراع نے مطالعۂ غالب کے لیے جو نیا زاویۂ نگاہ پیدا کیا ہے
فرہنگ کی ایزد ۔سے اس کی ہیئت ماند پڑ جاتی اور اس کی ساری کشش و جاذبیت ختم ہو
جاتی۔ یہی سبب تھا کہ عنوانات کی روشنی میں عنوانات سے متعلق اشعار کے معانی و مطالب
کے حسن و قبیح اور خوب و زشت پہ نگ الگ حاشیہ آرائی سے بھی گریز کرنا پڑا۔ جیسا
کہ ابتدائی سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ اس خصوص میں بھی غالب کے نقادِ اوّل مولانا حالی
سے لے کر اب تک اہلِ نقد و نظر اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اب اس پامال اور مسلوک
راہ پر کوئی مزید قدم اُٹھانا میرے خیال میں ایک سعیٔ لاحاصل ہے۔

جس طرح اشعار کا انتخاب ہمیشہ باعثِ رُسوائی رہا ہے۔ کم و بیش یہی قباحت عنوا
غالب کے اشعار کے مفہوم و معانی کے متعین کرنے میں لاحق ہوتی۔ خاص طور پر ان اشعار
میں جو پہلو دار اور کثیر المعانی ہیں۔ بلاشبہ اس باب میں مرزا غالب کے اشعار اپنی
مثال آپ ہیں۔ لہٰذا اس معاملہ میں جب بڑے بڑے سخن فہم اور صاحب نظر شارحین
مفہوم و معانی میں متفق اور ہم خیال نہ ہو سکے تو میرا اس نیرنگِ خیال اور موجِ تخیل میں بھٹک
یا گم ہو جانا معلوم۔ اس لحاظ سے میرا یہ دعویٰ کرنا بھی باطل ہوگا کہ مجوزہ عنوانات یا عنوانات
کے تحت اشعار کی تقسیم تمام تر صحیح اور درست ہے۔ دراصل معانی اور عنوانات کا تعین

ہر اہلِ نظر اور صاحبِ ذوق کے اپنے ہی مذاق اور سُوجھ بُوجھ پر منحصر ہے۔ اس دشواری کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے:

(۱) بعض اشعار ایک سے زیادہ معانی کے حامل تھے۔ اس لحاظ سے ایک ہی شعر دو دو بلکہ بعض مقامات پر تو تین تین عنوانات کے تحت لانے کے لائق تھا، لیکن اس تقسیم میں قباحت یہ تھی کہ ایک ہی شعر بار بار کئی جگہ درج ہوتا، اور یہ تکرار عنوانات میں تصادم کا باعث ہوتی اور اُس عنوان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔

(۲) بعض اشعار اپنے معانی کے لحاظ سے جدا جدا ایسے عنوانات کے طالب تھے جن کے ذیل میں ایک یا دو اشعار ہی آ سکتے تھے۔ مجبوراً باستثنائے چند ان اشعار کو ایسے عنوانات میں سمونا پڑا جو کسی نہ کسی اعتبار سے اُن کے ساتھ چسپاں ہو سکتے تھے۔ ورنہ عنوانات کی تعداد ضرورت سے زائد اور اُن کی جامعیت مفقود ہو جاتی۔

جہاں تک قصائد اور قصائد کے ابیات کا تعلق ہے چونکہ وہ بیک وقت مختلف مضامین یعنی تشبیب، گریز، مدح یا ہجو اور اختتام یا عرضِ مدعا پر مشتمل ہوتے ہیں لہذا ہم نے غزلوں کے درمیان آنے والے تہنیتی اور مدحیہ اشعار اور جملہ قصائد کو ممدوح کے اسم کی وضاحت کے ساتھ "تہنیت" اور "مدح" کے عنوانات کے ذیل الگ الگ درج کیا ہے۔ یہ عمل از بس ضروری تھا، ورنہ تمام ابیات مختلف عنوانات کی نذر ہو جاتے اور قصائد کا شیرازہ بکھر جاتا اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی مناسب بات نہ ہوتی۔

مثنویات، قطعات اور رباعیات کے باب میں بھی کم و بیش اسی التزام کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی اوّل جو قطعات مختلف غزلیات کے درمیان آتے ہیں اُن کے ابیات کو اُس غزل سے نکال کر قطعے کی صراحت کے ساتھ اُس کے متعلقہ عنوان میں جگہ دی ہے۔ باقی دو تمام مثنویات، قطعات اور رباعیات جو دیوان متداول کے مختلف نسخوں کے آخر میں بطور ضمیمہ

کلام شامل ہیں، انہیں نفسِ مضمون کی بنیاد پر علیحدہ مناسب عنوانات کے تحت لایا گیا ہے۔ اور یوں جملہ قصائد، مثنویات، قطعات اور رباعیات کو اپنے اپنے مقامات پر جُوں کا تُوں قائم اور دیوانِ متداول کی اصل ترتیب کو سالم اور برقرار رکھا ہے۔

اس نسخے کی ترتیب کے وقت راقم کے سامنے ایک نہایت اہم مسئلہ اشعارِ غالب کی عبارت اور الفاظ کی صحتِ املا کا بھی تھا۔ آخر میں جیسا کہ "کتابیات" سے واضح ہوگا، میرے مطالعے میں دیوانِ غالب کے قدیم و جدید نو مشرح اور چار بلا شرح جملہ تیرہ نسخے تھے۔ میں نے ان تمام نسخوں میں اشعار کی تعداد، عبارت اور بعض الفاظ کے املا میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور پایا ہے۔ آخر کار مطالعہ اور غور و فکر کے بعد، دیگر محاسن اور خصوصیات سے قطع نظر، میں نے جدید نسخۂ عرشی کو الفاظ و املاؔ کے اعتبار سے صحت، ضامن اور حرفِ اوّل و آخر پایا۔ یہی وجہ ہے اس نسخے میں زیرِ عنوان مندرج شدہ اشعار اسی دیوان سے لیے گئے ہیں اور وہی علامات و قرأت سامنے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ طاہر ایڈیشن کو متداول دیوان کے طور پر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ یہیں حواشی میں نسخہ طاہر ایڈیشن کا حوالہ بھی ہے گا کیونکہ ان اشعار کا ماخذ نسخۂ طاہر ہی ہے۔ میرے نزدیک ان نشانات کی افادیت یہ ہے کہ دورانِ مطالعہ اگر ناظرِ غالب کسی شعر سے متعلق غالب کی پوری غزل سے محظوظ ہونا چاہے تو نسخۂ عرشی یا متداول نسخوں میں سے جو نسخہ بھی اُس کے پاس موجود ہو وہ نہایت آسانی سے نکال کر دیکھ سکتا ہے۔

اشعار کے معنی اور مفہوم کے ضمن میں راقم نے ایک ایک شعر کے لیے مختلف شرحوں کا مطالعہ کیا ہے بلکہ اس موضوع پر میں بعض نقادانِ سخن کے نقد و تبصرے سے بھی مستفید ہوا ہوں۔ اس تقابلی مطالعے کے بعد یہ تجزیہ کر سکا ہوں کہ کون سا شعر کس عنوان کی زینت بن سکتا ہے۔

لے چونکہ فارسی میں صرف یائے معروف ہے اور اُردو میں یائے معروف و مجہول میں فرق رکھا گیا ہے، لہٰذا ایسے مقامات پر میں نے نسخۂ عرشی کا اتباع نہیں کیا ہے۔ (مرتب)

یہ حرفِ آخر اور حسن ہیچے۔ دیوانِ غالب کو موجودہ صورت میں لانے کا خیال میرے
دماغ میں ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ اس سے کوئی دو سال قبل میری سب سے پہلی تالیف
"موتی" شائع ہو چکی تھی۔ یہ "موتی" دراصل مجموعہ ہے کئی سو حکیمانہ اور شاعرانہ اقوال کا جن
کو میں نے اپنے طویل مقدمے کے ساتھ اخلاقی اور ادبی نقطۂ نظر سے مختلف موزوں عنوانات
کے تحت ترتیب دیا تھا۔ یہ کتاب دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔ مدّعا یہ کہ اسی خیال کی برقی رَو نے
مجھے سُرودِ غالب کا تصور بخشا تھا۔ واضح رہے کہ سُرودِ غالب اس نسخے کا جدید
نام ہے۔ ابتدا میں مَیں نے اس کا نام "آئینۂ غالب" تجویز کیا تھا۔ جیسا کہ اس کا اعلان
میری بعض تصانیف، میرے قائم کردہ "مکتبہ جہاں نما" دہلی کی مطبوعات اور دیگر اداروں کی
فہرستِ کتب میں موجود ہے۔

الغرض ۱۹۳۶ء میں جب مجھے یہ خیال سُوجھا تو مَیں نے فوراً ہی اپنے اس خیالی
خاکے میں رنگ بھرنا شروع کر دیا۔ یہ خاکہ مکمل ہونے کے قریب تھا کہ بخت واتفاق سے
۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں مولانا آسی لکھنوی مرحوم دہلی تشریف لائے۔ دلّی مرحوم کے عربک
کالج میں ایک ادبی نشست میں اُن سے ملاقات ہوئی۔ شاید مرزا غالب ہی کا کچھ مذکور
تھا کہ باتوں باتوں میں آسی مرحوم نے فرمایا کہ وہ غالب کے دیوان کو عنوانات کے تحت
ترتیب دے رہے ہیں اور اسے نول کشور، لکھنؤ شائع کرے گا۔ چونکہ مَیں خود یہی کام کر رہا تھا
لہٰذا اس توارد خیال پر دم بخود رہ گیا۔ اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مایوسی نے میری
قوتِ عمل کو مجھ سے چھین لیا ہو۔ مَیں گھر آیا، مسودے کو لپیٹا اور طاق میں رکھ دیا۔ کئی
سال تک یہ طاقِ نسیاں کی زینت ہی بنا رہا۔ تا آنکہ ایک روز مَیں نے مولانا آسی کی رحلت
کی خبر نہایت افسوس کے ساتھ اخباروں میں پڑھی۔ معاً دماغ کے دریچوں سے ماضی کی یاد
جھانکنے لگی۔ کئی سال پہلے کی وہ بات یاد آئی جو آسی مرحوم دیوانِ غالب کے متعلق مجھ سے
کہی تھی۔ مَیں نے فوراً ہی ایک خط نول کشور کو لکھا۔ اُن کا جواب آیا کہ آسی مرحوم اس نوعیت

کا ایک مجموعہ ہم کو دینے والے تھے لیکن افسوس وہ اپنی زندگی میں اُسے مکمل نہ کر سکے۔ آج بھی میرا یہ خیال ہے کہ اگر وہ نسخۂ آسی شائع ہو جاتا تو میرے اس نسخے سے بہت بہتر ہوتا۔

بہر نوع اُن کی وفات کے بعد میں نے خیال کیا کہ شاید یہ قرعۂ فال اسی دیوانے کے نام نکل چکا ہے بس دوبارہ اپنے نامکمل مسوّدے کی تکمیل میں مصروف ہو گیا۔ لیکن تقدیر میری اس تدبیر پر اب بھی ہنس رہی تھی۔ میں مسودہ مکمل کر چکا تھا اور پریس کو دینے ہی والا تھا کہ اچانک ۱۹۴۷ء کا خونچکاں انقلاب برپا ہوا اور بے سان و گمان سارا نظامِ زندگی درہم برہم ہو گیا۔ اس مسودے اور اثاث البیت کا تو ذکر ہی کیا جان بچانی مشکل تھی۔ بہرحال میں اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کراچی آ گیا۔ یہاں آنے کے بعد جس ٹرک میں مکتبۂ جہاں نما، حالی پبلشنگ ہاؤس اور کتب خانۂ علم و ادب کا سرمایۂ کتب پاکستان آ رہا تھا وہ راہ میں لُوٹ لیا گیا۔ اُسی میں یہ مسودہ بھی تھا۔ مجبوری کا نام صبر ہے۔ خاموش ہو گیا لیکن بقول مرزا غالب :

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

وہ گُمشدہ مسودہ اور اُس کا نقشِ خیال میرے دل و دماغ میں پتھر کی لکیر کی طرح نقش تھا۔ دن، ماہ و سال میں تبدیل ہوتے رہے۔ خدا خدا کر کے رہنے کا ٹھکانہ اور بسراوقات کے لیے روزگار نصیب ہوا تو دل و دماغ میں غالب کا تصور از سرِ نو انگڑائیاں لینے لگا۔ آخر اپنے ان شدید ذہنی تقاضوں سے مجبور ہو کر ایک مدتِ دراز کے بعد میں نے پھر قلم سنبھالا۔ مژگاں کو دعوت دی، جگر لخت لخت کو جمع کیا۔ آج خدا کا شکر بجالاتا ہوں، گنجینۂ معانی سے غالب کے پارہ ہائے دل پیش کرتا ہوں :

کس طرح حسن دوست ہے بے پردہ آشکار
صد ہا حجابِ صورت و معنی لیے ہوئے

صورت و معنی کے ان حجابات کو دُور کرنے اور اُن کی جلوہ نمائی میں مَیں جن دشوار گذار راہوں سے گُذرا ہوں اُن کا بیان بھی دشوار ہے۔ اس لیئے میں مرزا غالب ہی کے اس شعر کو اپنا ترجمان بناتا ہوں؛

فرجام سخن گوئی غالب، تو گویم
خونِ جگر است از رگِ گفتار کشیدن

مجھے اعتراف ہے کہ اس جنتِ فکر و نظر کی آراستگی میں میرے مخلص رفقا، جناب مولوی صلاح الدین صاحب قریشی، حضرت مولانا محمد زکریا مائل، جناب قیصر مراد آبادی اور جناب محمد ایوب صاحب قادری نے مجھے بڑی مدد دی۔ ناسپاسی ہوگی اگر میں ان حضرات کا شکریہ ادا نہ کروں۔ میں اپنے دوست مولانا اعجاز الحق صاحب قدوسی کا بھی ممنون ہوں۔ اگر وہ اس مسودے کی تکمیل کے لیے بار بار شدید تقاضے نہ کرتے تو خدا جانے یہ مسودہ کب تک معرضِ التوا میں پڑا رہتا۔

میرے دیرینہ خواب کی تعبیر تو نکل آئی لیکن خدا ہی جانے میں اِس نوائے سروش اور گنجینۂ معنی کے طلسم کی عقدہ کشائی میں کہاں تک کامیاب اور عُہدہ برآ ہو سکا ہوں۔

یُوسف بُخاری، دہلوی

بیتِ یُوسف بُخاری
۵-۱۴-کے-۲
ناظم آباد
کراچی

موجِ عرفاں

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

عرفان و توحید

محرم نہیں ہے تُو ہی، نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

اُسے کون دیکھ سکتا، کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دُوئی کی بُو بھی ہوتی، تو کہیں دو چار ہوتا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ "انا البحر"
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پُوچھنا کیا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے، اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہوا، دیدۂ بینا نہ ہوا

ہنوز محرمیِ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مُو، کام چشمِ بینا کا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں، میں جب سے کہ گریباں سمجھا

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں، تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

نہ ہو، بہ ہرزہ، بیاباں نوردِ وہمِ وجُود
ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

پرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
مَیں بھی ہُوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ، پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ہے، تجلّی تری سامانِ وجُود
ذرّہ، بے پرتوِ خورشید نہیں

اُتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہُود و شاہد و مشہُود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اِک ادائے ناز ہے، اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ یُوں ہیں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ، دائم، نقاب میں

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے، عالم — لوگ کہتے ہیں کہ "ہے"، پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں، تو ناچار کیا کریں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم — ملّتیں جب مٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئنہ — طوطی کو شش جہت سے، مقابل ہے آئنہ

نشو و نما ہے اصل سے، غالبؔ فروع کو — ق خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں، جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر، پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی — رُو سُوئے قبلہ وقتِ مُلاقات چاہیے

یعنی، بحسبِ گردشِ پیمانۂ صفات — عارف، ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

کثرت آرائیِ وحدت، ہے پرستاریِ وہم — کر دیا کافر، ان اصنامِ خیالی نے مجھے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — ق پھر یہ ہنگامہ، اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

ہاں اہلِ طلب، کون سُنے طعنۂ نایافت؟ — دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟ — پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے — پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جُز وہم نہیں، ہستیِ اشیا، مرے آگے

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

حمد

کِس مُنہ سے شکر کیجیے اس لُطفِ خاص کا ۔۔۔ پُرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں
ہے کائنات کو حرکت، تیرے ذوق سے ۔۔۔ پرتَو سے آفتاب کے، ذرّے میں جان ہے
ہے وُہی بدمستی ہر ذرّہ کا خود عذر خواہ ۔۔۔ جس کے جلوے سے، زمیں تا آسماں سرشار ہے
بے گانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالبؔ ۔۔۔ کوئی نہیں تیرا، تو، مری جان، خُدا ہے
ہے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا ۔۔۔ بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نعت

کِس واسطے عزیز، نہیں جانتے مجھے؟ ۔۔۔ لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہُوں مَیں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟ ۔۔۔ رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہُوں مَیں
کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے؟ ۔۔۔ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہُوں مَیں

منقبت

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بُوئے دوست ۔۔۔ مشغولِ حق ہُوں، بندگیِ بوترابؑ میں
مُشکیں لباسِ کعبہ، علیؑ کے قدم سے جان ۔۔۔ نافِ زمین ہے، نہ کہ نافِ غزال ہے
امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صُورت و معنی ۔۔۔ علیؑ ولی، اسد اللہ، جانشینِ نبیؐ ہے
کیا غم ہے اُس کو جس کا علیؑ سا امام ہو ۔۔۔ اتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے

تصوّرِ قبلہ

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود ۔۔۔ قبلے کو، اہلِ نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

دُعا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو، یارب، یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں، فسونِ نیاز
دُعا قبول ہو، یارب کہ عمرِ خضر دراز

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدّعا نہ مانگ

غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

خضر سلطاں کو رکھے، خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں، یہ تازہ نہال اچھا ہے

شاہ کے، ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

بارگاہِ شاعر

آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے، اپنے عالمِ تحریر کا

دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو، جو نہ دے مجھ کو زباں اور

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور

پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی
رُوح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے، اسد
کُھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں، کہ میری بات سمجھنی محال ہے

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صِلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

ہے، وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
حُسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے' اسدؔ پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی
بقدرِ شوق نہیں' ظرفِ تنگنائے غزل کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے
مَیں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھُل گیا،
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہوگئیں

غالبؔ، اپنے اور اپنے شعر کے بارے میں جب بھی کچھ کہتے ہیں اس میں بلندی اور اَنا کی وہ حالت ہے جسے استغنا کہیے، ماورائیت کہیے، اپنے پر اعتماد کہیے، غیر کو نہ آزملنے کا ارادہ کہیے' سب بجا ہے۔ وہ جلوۂ چمن اور دادِ روح القدس' کو تخلیقِ شعر کا سبب بتاتے ہیں، اِس واسطے نہ ستایش کی تمنّا ہے نہ صلے کی پَروا' وہ تو صرف وسعت بیاں کے متمنّی ہیں اور یہی تمنّا رَوانیِ طبع اور کشادِ خاطر وابستہ بن گئی۔

نفسیاتی لحاظ سے ان شعروں میں شعوُر کی وہ تلاطم خیز حالت ہے جس میں زور زیادہ اور شور کم ہے۔ اندر ہی اندر پھیلنا مگر سطح کو ہموار اور پُرسکون رکھنا، چنگاری جیسی حرارت اور چمک' ذہین انسان کی طرح اپنے آپ کو پہچاننا، دوسروں کے سامنے آنا مگر آئینہ کی طرح صاف اور شفاف اور سادہ، دیکھنے والا چاہے تو اپنی صورت دیکھ کر خوش ہو جائے اور اگر غور کرے تو شیشہ کی دبازت' جلا' جلوہ آفرینی' نورانیت اور صفائے باطن دیکھ کر اُسے قیمتی اور گرد وغبار سے بچانے کے لائق متاعِ عزیز سمجھے۔ یہ باتیں 'دلِ گداختہ' والا کر سکتا ہے اور غالبؔ کے حضوُر میں بار پانے کی یہی شرط ہے۔

تعلّی و خود ستائی

یہ لاشِ بے کفن، اسدِؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

یہ مسائلِ تصوّف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا، نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

تازہ نہیں ہے، نشّۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیِ قدیم ہوں، دُودِ چراغ کا

ریختہ کے تمہی اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں "اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا"

سُرمۂ مفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

لکھتا ہوں، اسدؔ، سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے، کوئی مرے حرف پر انگشت

حُسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے، کوئی، قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا، میرے بعد

شمع بجھتی ہے، تو اُس میں سے دُھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں، احوالِ بُتاں پر، یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا، میرے بعد

درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو، جا
نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا، میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا، میرے بعد

ہے جنوں، اہلِ جنوں کے لیے آغوشِ وداع
چاک ہوتا ہے، گریباں سے جدا، میرے بعد

غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا، میرے بعد

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اسدؔ اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا! وہ رندِ شاہد باز

زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ، خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں، اے خُدا
رکھ لیجو میرے دعویِٔ وارستگی کی شرم

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی، غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے، تو ہشیار بھی نہیں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں؟

جو یہ کہے کہ "ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی"؟
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یُوں

سخن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جویا ہوں جواہر کے؟
جگر کیا ہم نہیں رکھتے، کہ کھودیں جا کے معدن کو

وہ اپنی خُو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سُبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضرؔ کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبؔ آشفتہ سر ملے

مَیں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مُفت ہاتھ آئے، تو بُرا کیا ہے؟

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ، غالبؔ، مرے اشعار میں آوے

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ہے

کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار؟
مگر آشفتہ بیانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے، گرانی میری

ابھی آتی ہے بُو بالش سے اُسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو، خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں، لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے؟

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں، مرے نزدیک
اِک بات ہے، اعجازِ مسیحا، مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ، مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو، اچھا، مرے آگے

غمِ عشاق، نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے؟

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہ سنگ آمدہ، پیمانِ وفا ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے، یارانِ نکتہ داں کے لیے

حریمِ خیال

تھا، خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کُھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سُود تھا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسُردہ گویا، حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اک دَر ہے، میری گور کے اندر کھُلا

منظر اک بلندی پر، اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا، کاشکے، مکاں اپنا

ترے خیال سے رُوح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزیِ باد، و بہ پر فشانیِ شمع

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بتخانہ ہم

خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں مے کش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟
آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہاتھ دھو دل سے، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ، تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

دیدار، بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال، میکدۂ بے خروش ہے

آئینۂ فطرت

یک ذرۂ زمیں نہیں بے کار، باغ کا
یاں جادہ بھی، فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

ذرہ ذرہ، ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں، بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا

غافل، بوہمِ ناز، خود آرا ہے، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں، طرّۂ گیاہ کا

ضدّین

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن، زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

ضعف سے، گریہ مبدّل بدمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے، بادہ و ساغر کہے بغیر

متقابل ہے، مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

وجود و عدم

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ، غافل، بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

مری تعمیر میں مضمر ہے، اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے، خونِ گرمِ دہقاں کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں، اور افسوس حاصل کا

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا

نہ گُل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غمِ ہستی کا، اسدؔ، کس سے ہو جُز مرگ، علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے، سحر ہونے تک

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ملتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ
عالم تمام، حلقۂ دامِ خیال ہے

مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

کارگاہِ ہستی میں لالہ، داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو، فرصت روانی کی

ہستی ہماری، اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالبؔ
آخر تو کیا ہے، اے نہیں، ہے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے
بے تکلّف، اے شرارِ جستہ، کیا ہو جائیے

بیضہ آسا، ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب، اِدھر بھی
سائے کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

عالمِ عبرت

اہلِ بینش کو ہے، طوفانِ حوادث، مکتب — لطمۂ موج، کم از سیلیِ استاد نہیں
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ، صبح ہوتے تک[۱] — رکھو نہ شمع پر، اے اہلِ انجمن، تکیہ
ہے عدم میں، غنچہ، محوِ عبرتِ انجامِ گُل — یک جہاں زانو تامل، در قفائے خندہ ہے

کرم و بخشش

وسعتِ سعیِ کرم دیکھ، کہ سرتا سرِ خاک — گزرے ہے آبلہ پا، ابرِ گہربار ہنوز
مجھ کو پوچھا، تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تُو غریب نواز
بنا کر فقیروں کا، ہم بھیس غالبؔ — تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

زُہد و تقویٰ

زُنّار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے، راہ کو ہموار دیکھ کر
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟ — ٹیڑھا لگا ہے قط، قلمِ سرنوشت کو
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
کیا زُہد کو مانوں؟ کہ نہ ہو گرچہ ریائی — پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو، مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلُودہ بہ مے، جامۂ احرام، بہت ہے

۱۔ طاہر ایڈیشن ص ۶۳، نسخۂ عرشی، حصہ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۰۳،

بہشت

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا ۔۔۔ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

کوئی دُنیا میں مگر باغ نہیں ہے، واعظ! ۔۔۔ [1] خُلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن ۔۔۔ دل کے خوش رکھنے کو، غالب، یہ خیال اچھا ہے

مقدّر

جُز قیس، اور کوئی نہ آیا بروئے کار ۔۔۔ صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسُود تھا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے ۔۔۔ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا ۔۔۔ اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

نام کا میرے ہے، جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا؛ ۔۔۔ کام میں میرے ہے، جو فتنہ کہ برپا نہ ہوا

زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما ۔۔۔ کام گر رُک گیا، روا نہ ہوا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۔۔۔ اُس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ ابجد ۔۔۔ تھا لکھا، بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا

کہتے ہو: "کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں؟" ۔۔۔ گویا جبیں پہ سجدۂ بُت کا نشاں نہیں

سبدِ گل کے تلے بند کیے ہے، گلچیں، ۔۔۔ مژدہ، اے مُرغ، کہ گلزار میں صیّاد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام؟ ۔۔۔ دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے ۔۔۔ خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کِشت کو

خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے؟ ۔۔۔ سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۴، نسخۂ عرشی، حصّہ سوم یادگارِ نالہ ص ۳۱۱

بھاگے تھے ہم بہت، سو اُسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر، دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دُور دُور
تن سے سوا فگار ہیں، اس خستہ تن کے پانو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیوں کر ہو

ہوا ہے، کاٹ کے چادر کو، ناگہاں غائب [1]
اگرچہ زانوے تل پہ رکھے، دمن تکیہ

ہم اور تم، فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں [2]
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے کہن تکیہ

پیکِ عشاق، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ گویا، گردشِ سیّارہ کی آواز ہے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ اُلفت،
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

خوب تھا، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں، اور بُرا ہوتا ہے

اسدؔ، خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھُول گئے
کہا جو اُس نے "ذرا میرے پانو داب تو دے"

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی، مجھے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود [3]
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات، کہ اُن کو
اِنکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے

علائقِ دنیوی

بنالہ، حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر، جُز صدا، معلوم

بفکرِ دُنیا میں سر کھپاتا ہوں
مَیں کہاں اور یہ وبال کہاں؟

---

[1] [2] طاہر ایڈیشن ص ۶۳، نسخۂ عرشی، حصۂ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۰۳،

[3] طاہر ایڈیشن ص ۶۶، نسخۂ عرشی، حصۂ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۱۲

نہ لُٹتا دن کو، تو کب رات کو یُوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہ ہو — ق — ہم سخن کوئی نہ ہو، اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیے — کوئی ہمسایہ نہ ہو، اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے، تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

بے صرفہ ہی گذرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"

ہوسِ گُل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا — عجب آرام دیا بے پَر و بالی نے مجھے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے — کر گئی وابستۂ تن، میری عُریانی مجھے

آرزُوئے خواب

لُوں دام، بختِ خُفتہ سے یک خوابِ خوش ولے — غالبؔ، یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کریں

موت کا ایک دن معیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

وہ، آ کے خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے — ولے مجھے تپشِ دِل مجالِ خواب تو دے

اُمّید و یاس

یاس و اُمّید نے یک عَربَدہ میداں مانگا — عجزِ ہمّت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

بعدِ یک عمرِ وَرع، بار تو دیتا، بارے — کاش! رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

مَیں سادہ دِل، آزُردگیِ یار سے خوش ہُوں — یعنی، سبقِ شوقِ مکرّر نہ ہوا تھا

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ — اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بُردہ کو سمجھے ہُوئے ہیں قرض رہزن پر

آہ کو چاہیے ایک عمر، اثر ہونے تک — کون جیتا ہے، تری زلف کے سر ہونے تک

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے — کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے کیا کہتے ہیں؟

کہتے ہیں، "جیتے ہیں اُمید پہ لوگ"
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

سرگشتگی میں، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکین کو نوید کہ مرنے کی آس ہے

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی"
زندگی سے بھی، مرا جی ان دنوں، بیزار ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیے

سنبھلنے دے مجھے اے نااُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

ذوقِ نظر

بخشے ہے جلوۂ گل، ذوقِ تماشا، غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

درسِ عنوانِ تماشا، بہ تغافل خوشتر
ہے نگہ، رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ کو

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم [1]
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ذوقِ معصیت

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار، یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

جب کرم رخصتِ بے باکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

---

[1] ظاہرا ایڈیشن ص ۶۶، نسخۂ عرشی، حصّہ سوم یادگارِ نالہ ص ۳۱۲

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے ‌ ‌ ‌ آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں
بقدرِ حسرتِ دل چاہیے، ذوقِ معاصی بھی ‌ ‌ ‌ بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ‌ ‌ ‌ یارب، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ذوقِ نغمہ

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع؟ ‌ ‌ ‌ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
ڈھونڈے ہے اُس مغنیِّ آتش نفس کو جی ‌ ‌ ‌ جس کی صدا، ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

حجاب

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن ‌ ‌ ‌ غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا
بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار ‌ ‌ ‌ نگاہِ شوق کو ہیں بال و پَر، در و دیوار

بے ثباتی

جلائے پلئے خزاں ہے، بہار اگر ہے بھی ‌ ‌ ‌ دوام، کلفتِ خاطر ہے، عیش دنیا کا
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے ‌ ‌ ‌ وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا، تو کیا ہوتا؟"
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ ‌ ‌ ‌ صیدِ زدامِ جستہ ہے، اس دام گاہ کا
افسوس! کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے ‌ ‌ ‌ جن لوگوں کی، تھی درخورِ عقدِ گہر، انگشت
لرزتا ہے مرا دل، زحمتِ مہرِ درخشاں پر ‌ ‌ ‌ مَیں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
یکسا نظر بیش نہیں، فرصتِ ہستی، غافل ‌ ‌ ‌ گرمیِ بزم ہے، اِک رقصِ شرر ہونے تک
ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گُل ‌ ‌ ‌ بُلبُل کے کاروبار پہ ہیں، خندہ ہائے گُل
جو تھا، سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا ‌ ‌ ‌ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گُل

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے
گر چراغانِ سرِ رہ گزرِ باد نہیں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد، یاں

تیری فرصت کے مقابل، اے عمر
برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو، برق آفتاب ہے

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی، غالب، اگر عمرِ طبیعی، نہ سہی

بازیچۂ اطفال ہے، دُنیا، مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

عرضِ نازِ شوخیِ دنداں، برائے خندہ ہے
دعویِ جمعیتِ احباب، جائے خندہ ہے

تا کجا، اے آگہی، رنگِ تماشا باختن ؟
چشمِ واگردیدہ، آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

عالَم، غبارِ وحشتِ مجنوں ہے، سر بسر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی ؟

نالہ، سرمایۂ یک عالم و عالم، کفِ خاک
آسماں، بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا، جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

آشفتگی

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دُود تھا

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بےدماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے، ناک میں آتا ہے دم میرا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ، ہر یک حلقۂ گرداب تھا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا — زیارت کدہ ہوں، دلِ آزردگاں کا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار [1] — سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی — ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

تپش سے میری، وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے — مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ، نور العین دامن ہے — دلِ بیدست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

خاکساری و قناعت

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں — پہلوئے اندیشہ، وقفِ بسترِ سنجاب تھا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا!

اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اِتراتا — وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

درسِ فنا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی — میں ورنہ، ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تھی نوآموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا — اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

---

[1] ماخوذ از شرح سلیم چشتی ص ۳۸۴ و شرح نظامی ص ۴۵ طبع ششم؛

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ   کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا   نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

عُمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ   مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا

عشرتِ قطرہ ہے، دریا میں فنا ہو جانا   درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت   پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہُوں اس زمانے سے   کہ مجنوں "لام الف" لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

کرے ہے، صرف بایمائے شعلہ، قصہ تمام   بطرزِ اہلِ فنا ہے، فسانہ خوانیِ شمع

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں   خاک میں کیا صُورتیں ہونگی کہ، پنہاں ہوگئیں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟   روئیے زار زار کیا، کیجیے ہائے ہائے کیوں؟

مقدُور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم   تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ہو چکیں غالبؔ، بلائیں سب تمام   ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

قطرہ دریا میں جو مِل جائے تو دریا ہو جائے   کام اچھا ہے وہ، جس کا کہ مآل اچھا ہے

پُوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا   آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

غفلت، کفیلِ عمر و اسدؔ، ضامنِ نشاط   اَے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں رُوشناسِ خلق، اے خضرؔ   نہ تُم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

شمعِ ہدایت

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے،
میری سُنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

عنوان	صفحہ

پند و نصیحت

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پُوچھے: "تم نے کیا مزا پایا؟"

حضرتِ ناصح گر آویں، دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟ — کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تُو بھی دانا ہے اسدؔ — دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے — دُشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

رندانِ درِ میکدہ گُستاخ ہیں، زاہد — زنہار! نہ ہونا طرف اِن بے ادبوں کے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دِل — زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے — میری سُنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی، بجلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی — مُطرب، بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں — نے وہ سُرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اِک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالبؔ، صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر — جائے مَے اپنے کو کھینچا چاہیے

زبسکہ، مشقِ تماشا، جنوں علامت ہے — کشاد و بستِ مژہ، سیلیِ ندامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس، سلکِ عافیت مت توڑ — نگاہِ عجز، سرِ رشتۂ سلامت ہے

جو مدعی بنے، اُس کے نہ مدعی بنیے — جو ناسزا کہے، اُس کو نہ ناسزا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت، نہ ہو، نگار تو ہے — روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے — طراوتِ چمن و خوبیِ ادا کہیے

نہ سنو، گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی

روک لو، گر غلط چلے کوئی — بخش دو، گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

غالبؔ بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

مقامِ انسانیت

بسکہ دُشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسّر نہیں اِنساں ہونا

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند — گُستاخیِ فرشتہ، ہماری جناب میں

تم ہو بُت، پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے؟ [1] — تم خُداوند ہی کہلاؤ، خُدا اور سہی

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلُوم — لے لیا مجھ سے مری ہمّتِ عالی نے مجھے

یوں ہی دُکھ کسی کو دینا نہیں خوب، ورنہ کہتا — کہ "مرے عدُو کو، یارب، ملے میری زندگانی"

تقلیدِ رُسوم

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن، اسدؔ — سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیُود تھا

کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ — سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پُوجتا ہوں اُس بُتِ بیداد گر کو میں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب — ہم کو تسلیم، نکو نامیِ فرہاد نہیں

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا [2] — کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہ کن تکیہ

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۴، نسخۂ عرشی، حصۂ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۱۱

[2] طاہر ایڈیشن ص ۶۳، نسخۂ عرشی، حصۂ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۰۳

خدا کے واسطے، پردہ نہ کعبے سے اُٹھا، واعظ [1]
کہیں ایسا نہ ہو، یاں بھی وُہی کافر صنم نکلے

ہیں اہلِ خرد کس رَوشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

تعلّقِ خاطر

یہ غزل اپنی، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں، غالبؔ، زبس تکرارِ دوست

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے، اسدؔ
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

گو واں نہیں، پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے، ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

رازِ عشق

نہ کہہ کسی سے کہ، غالبؔ، نہیں زمانے میں
حریفِ رازِ محبت، مگر درو دیوار

لافِ تمکیں، فریبِ سادہ دلی
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

گرچہ ہے، طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
مُنہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

در پردہ اُنہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

---

[1] نسخۂ عرشی میں یہ شعر شامل نہیں ہے،

حُسنِ تدبیر

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری　　تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
چاہیے اچھوں کو، جتنا چاہیے　　یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چاہیے
شادی سے گزر کہ غم نہ رہوے　　اُردی جو نہ ہو، تو دے نہیں ہے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے　　غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

حُسنِ عمل

تجھے بہانۂ راحتِ انتظار، اے دِل!　　کیا ہے کس نے اِشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
صفائے حیرتِ آئینہ، ہے سامانِ زنگ آخر　　تغیر آب برجا ماندہ کا، پاتا ہے رنگ آخر
بس ہجومِ نااُمیدی! خاک میں مِل جائے گی　　یہ جو اِک لذّت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
ہم سخن، تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا　　جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال، اچھا ہے

حُسنِ طلب

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دُونا ہو التفات　　سُنتا نہیں ہوں بات، مکرّر کہے بغیر
غالب، نہ کر حضُور میں تو عرض بار بار　　ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کہے بغیر
غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یُوں　　بوسے کو پوچھتا ہُوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یُوں
تُم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو　　مجھ کو بھی پُوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
غالب، گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں　　حج کا ثواب نذر کروں گا حضُور کی

حق شناسی

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　　حق تو یُوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید　　"مرگیا غالبِ آشفتہ نوا" کہتے ہیں

غالب، اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ　　"آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میرؔ نہیں"

صاف گوئی

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم　　سر جائے یا رہے، نہ رہیں پر کہے بغیر

رکھیو، غالب، مجھے اس تلخ نوائی میں معاف　　آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بارِ احساں

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں راضی کہ کبھی　　گوش، منت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

غیر کی منت نہ کھینچوں گا، پئے توقیرِ درد　　زخم، مثلِ خندہ ٔ قاتل، ہے سراپا نمک

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو　　خوش ہوں، گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

ڈالا نہ بےکسی نے کسی سے معاملہ　　اپنے سے کھینچتا ہوں، خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے، انفعال　　حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

صد جلوہ روبرو ہے، جو مژگاں اُٹھائیے　　طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق　　یعنی ہنوز منتِ طفلاں اُٹھائیے

دیوار، بارِ منتِ مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب، نہ احساں اُٹھائیے

بے طلب دیں، تو مزا اُس میں سوا ملتا ہے　　وہ گدا، جس کو نہ ہو خوئے سوال، اچھا ہے

تشکّر و امتنان

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے   خارِ رہ کو ترے، ہم مہرِ گیا کہتے ہیں
اُڑتی پھرے ہے، خاک مری، کوئے یار میں   بارے اب اے ہوا، ہوسِ بال و پر گئی
دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی   میرزا یوسف ہے، غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

فقدانِ ہمّت

ضعف سے ہے، نے قناعت سے، یہ ترکِ جستجو   ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمّتِ مردانہ ہم
رہا آباد عالم، اہلِ ہمّت کے نہ ہونے سے   بھرے ہیں جسقدر جام و سبُو، میخانہ خالی ہے

خوُشامد

ہے بزمِ بُتاں میں، سخن، آزردہ لبوں سے   تنگ آئے ہیں ہم، ایسے خوشامد طلبوں سے

ہَوا و ہَوس

فروغِ شعلۂ خس، یک نفس ہے   ہوس کو پاسِ ناموُسِ وفا کیا؟
کی اُس نے گرم، سینۂ اہلِ ہوس میں، جا   آوے نہ کیوں پسند، کہ ٹھنڈا مکان ہے؟
ہر بوُالہوس نے حسُن پرستی شعار کی   اب آبروُئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
اہلِ ہوس کی فتح ہے، ترکِ نبردِ عشق   جو پانو اُٹھ گئے، وہی اُن کے علم ہوئے
غارت گرِ ناموُس نہ ہو، گر ہوسِ زر   کیوں شاہدِ گُل، باغ سے بازار میں آوے

قرض

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بغض و حسد

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

حسد سے دل اگرچہ افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

تہمت و بدگوئی

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے، تہمت نگہ کی، چشمِ روزن پر

کی وفا ہم سے، تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذت زندگانی کی

آفات و آلام

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

حیراں ہوں، دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

رنج سے خُوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے؟

غنچہ تا شگفتنہا، برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی، خوابِ گُل پریشاں ہے

پنہاں تھا، دام، سخت قریب آشیاں کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

غربت

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

شکوۂ فلک و زمانہ

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالبؔ! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلّی میں رہے، کھاویں کیا؟

ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بےکسی کی شرم

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نوا سنجانِ گلشن کو

ناچار بےکسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمرہاں نہ پوچھ

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں، غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزرے، غالبؔ
مارا زمانے نے، اسد اللہ خاں، تمہیں
خستگی کا تم سے کیا شکوہ؟ کہ یہ
حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے؟
رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی
ہتکنڈے ہیں، چرخِ نیلی فام کے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے؟
کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے،

سوز و ساز

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
و لے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

عنوان	صفحہ

محبّت و عشق

جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
شوق، ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا
سر بُنِ مُو سے دمِ ذکر، نہ ٹپکے خوناب
بُلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں؟
شوق، ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
نہ ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعویِ وارستگی
عشق تاثیر سے نومید نہیں
قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
سایہ میرا، مجھ سے، مثلِ دُود، بھاگے ہے اسدؔ
رگِ لیلیٰ کو، خاکِ دشتِ مجنوں، ریشگی بخشے
چھوڑی، اسدؔ، نہ ہم نے گدائی میں دل لگی،
دل و جگر میں پَر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
عشق کی راہ میں، ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال

مبارک باد! اسدؔ، غم خوارِ جانِ دردمند آیا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا
حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا
کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا
ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
جو کہ کھایا خونِ دل، بے منتِ کیموس تھا
ذرّہ صحرا دستگاہ، و قطرہ دریا آشنا
اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج؟
انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں
سرو ہے، باوصفِ آزادی، گرفتارِ چمن
جاں سپاری، شجرِ بید نہیں
لیکن آنکھیں، روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے
اگر بووے بجائے دانہ، دہقاں نوک نشتر کی
سائل ہوئے، تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے
سست رَو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
نگہِ گرم سے اِک آگ ٹپکتی ہے، اسدؔ — ہے چراغاں، خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش، غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے
غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو — چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر — ہر ذرّے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

سوز و غم

لیتا ہوں، مکتبِ غمِ دل میں، سبق ہنوز — لیکن یہی کہ "رفت" "گیا" اور "بود" تھا
دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا — آتشِ خاموش کی مانند، گویا جل گیا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب — دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گُسل ہے، پہ کہاں بچیں، کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
وہ، مری چینِ جبیں سے، غمِ پنہاں سمجھا — رازِ مکتوب، بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل، جگر تشنۂ فریاد آیا
تاب لائے ہی بنے گی، غالبؔ — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انہیں کچھ نہ کہو — جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
نغمہ ہائے غم کو بھی، اے دل، غنیمت جانیے — بے صدا ہو جائے گا، یہ سازِ ہستی ایک دن
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ، اہلِ بزم؟ — ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں؟
"پیدا ہوئی ہے" کہتے ہیں "ہر درد کی دوا" — یوں ہو، تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو
کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی، وہ میرا رازداں کیوں ہو
غمِ دُنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی — فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ "داغ جگر کا نشان ہے"

نزلا، یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے، کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے، نہ آہِ نیم شبی ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے! اگر معرضِ اظہار میں آوے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی، یارب، کئی دیے ہوتے

ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز ے
جو داغ نظر آیا، اک چشم نمائی ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ، دنداں در دل افشردن، بنائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب، آشنائے خندہ ہے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

متاعِ دل و جگر

دوستدارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم
آہِ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بار ہا ڈھونڈا، تم نے بار ہا پایا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا، ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا

کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا؟

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

ہے ایک تیر، جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا، دل سے، جگر جُدا تھا

تنگیِ دل کا گِلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا، تو پریشاں ہوتا

آہ، وہ جرأتِ فریاد کہاں؟
دل سے تنگ آکے، جگر یاد آیا

پھر ترے کُوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ، مگر، یاد آیا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر، اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

مَیں، اور ایک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی، کہ ہے
عافیت کا دشمن، اور آوارگی کا آشنا

دل ہوا، کشمکشِ چارۂ زحمت میں، تمام
مِٹ گیا گھسنے میں، اُس عقدے کا وا ہو جانا

جگر کو مرے، عشقِ خونابہ مشرب
لکھے ہے: خداوندِ نعمت سلامت

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی

حال آنکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مَے کا گمان ہے

دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی
غیرِ گل، آئینۂ بہار نہیں ہے

سیماب پُشت گرمیِ آئینہ دے ہے، ہم
حیراں کیے ہوئے ہیں، دلِ بیقرار کے

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر، متاعِ دستِ گرداں ہے

دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی
اے بے دماغ، آئینہ تمثال دار ہے

شبنم بہ گلِ لالہ، نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بے درد، نظرگاہِ حیا ہے

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ، بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے

جذب و شوق

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہُر میں محو ہوا، اضطراب دریا کا

جب بتقریبِ سفر، یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرّے پہ اک دل باندھا

نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں، غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

ہاں، وہ نہیں خدا پرست، جاؤ، وہ بیوفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُسکی گلی میں جائیں کیوں

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یُوں

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

گردِ بادِ رہِ بے تابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

شوقِ دیدار میں، گر تُو مجھے گردن مارے
ہر نگہ، مثلِ گُلِ شمع، پریشاں مجھ سے

ہیں بُلاتا تو ہوں اُس کو، مگر، اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

ہے ذرّہ ذرّہ، تنگیِ جا سے، غبارِ شوق
گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمک داں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

باغِ آرزو

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزُو
توڑا جو تُو نے آئنہ تمثال دار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو، کہ مَیں
جاں دادۂ ہوائے سرِ رہ گزار تھا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنّائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا؟

زکاتِ حُسن دے، اے جلوۂ بینش، کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

دلائے اگر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

سادگی ہائے تمنّا، یعنی
پھر وہ "نیرنگِ نظر" یاد آیا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے، تو کیا؟
بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

ہر ایک ذرّۂ عاشق ہے آفتاب پرست
گئی نہ خاک ہوئے پر، ہوائے جلوۂ ناز

وہ دن بھی ہو! کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز

عاشقی صبر طلب اور تمنّا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک؟

غالبؔ، مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزُو
جس کا خیال، ہے گلِ جیبِ قبائے گُل

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنّائیں، اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پُرخوں کو زنداں خانہ ہم

تماشا کر، اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنّا سے ہم دیکھتے ہیں

غلط نہ تھا، ہمیں خط پر گماں تسلّی کا
نہ مانے دیدۂ دیدار جُو، تو کیونکر ہو؟

یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

نہ لائی، شوخیِ اندیشہ، تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس مَلنا، عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

دل لگی کی آرزُو بے چین رکھتی ہے ہمیں
ورنہ یاں بے رونقی، سُودِ چراغِ کشتہ ہے

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں، خلوت ہی سہی

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ، طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں، جذبِ محبّت
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

دیکھیے پاتے ہیں عشّاق بُتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ "یہ سال اچھا ہے"

قہر ہو یا بَلا ہو، جو کچھ ہو
کاشکے! تم مرے لیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر، غالبؔ
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

وائے! واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں، ذوقِ تن آسانی، مجھے

منہ نہ دکھلاوے، نہ دکھلا، پر بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ، ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

میں نامراد دل کی تسلّی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

ذوقِ لذّتِ آزار

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دَم شمشیر کا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب!
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

دھمکی میں مر گیا، جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ، طلبگارِ مرد تھا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا، کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اُس گرہِ نیم باز کا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

مقدمِ سیلاب سے، دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق، مگر، سازِ صدائے آب تھا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے، شمشیر کا عُریاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا
لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

دوست غمخواری میں میری، سعی فرماویں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا؟

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر، میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا؟

کوئی میرے دل سے پوچھے، تیرے تیرِ نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا؟

محابا کیا ہے؟ میں ضامن، اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا؟

نہ مارا جان کر بے جرم، غافل، تیری گردن پر
رہا، مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں؟
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہوا جب غم سے یوں بے حس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں؟ کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی
آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا؟

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل، خیالِ زخم سے، دامن نگاہ کا

جاں، در ہوائے یک نگہِ گرم ہے، اسدؔ
پروانہ، ہے وکیل ترے داد خواہ کا

ہے مجھے، ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں، فنا ہو جانا

بر نیمِ غمزہ، ادا کر حقِ ودیعتِ ناز
نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

نہ پوچھ بےخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سربسر، در و دیوار

وا حسرتا! کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا؟
قیامت اِک ہوائے تند، ہے خاکِ شہیداں پر

مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اُڑ جائے
جلاد کو، لیکن، وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا! قاتل سے کہتا تھا
کہ "مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

جگر تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا
جُوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اِک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار، حیف

زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل
ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو
نالۂ بلبل کا درد، اور خندۂ گل کا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق، حیف ہے
دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

یاد ہیں، غالبؔ، تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چُنتا تھا نمک

اِک شرر دل میں ہے، اُس سے کوئی گھبرائیگا کیا؟
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں

قطرہ قطرہ، اِک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی، ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے
ق ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ "ہَل مِن مزید" ہے
لب، پردہ سنجِ زمزمۂ "الاماں" نہیں

خنجر سے چیر سینہ، اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھُری چبھو، مژہ گر خوں چکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل، نفس اگر آذر فشاں نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہِ وفا، جُز دمِ شمشیر نہیں

سر کھجاتا ہے، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذّتِ سنگ، باندازۂ تقریر نہیں

ملتی ہے خوئے یار سے، نار التہاب میں
کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق
مژدۂ قتل مُقدّر ہے، جو مذکور نہیں

نالہ، جز حُسنِ طلب، اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں، یارب؟
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں،
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالبؔ، یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی، جلے ہوؤں میں، ہوں داغِ ناتمامی

کیجے بیاں سُرورِ تبِ غم کہاں تلک
ہر مُو، مرے بدن پہ، زبانِ سپاس ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟
ہم نہیں جلتے، نفس ہر چند آتش بار ہے

عمر، ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے، پر نہیں آتی

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ، جُویائے زخمِ کاری ہے

چشم، دَلّالِ جنسِ رُسوائی — دل، خریدارِ ذوقِ خواری ہے
وُہی صد رنگ نالہ فرسائی — وُہی صد گونہ اشک باری ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی، نہ سہی — امتحاں اور بھی باقی ہو، تو یہ بھی نہ سہی

قتل کا میرے کیا ہے عہد تو، بارے — وائے! اگر عہد استوار نہیں ہے

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّتِ زخمِ سوزن کی — سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

عجب نشاط سے جلاّد کے، چلے ہیں ہم، آگے — کہ اپنے سائے سے، سر، پانوں سے ہے دو قدم آگے

گو سمجھتا نہیں، پر حُسنِ تلافی دیکھو — شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد؟ کہ ہم — آپ اُٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے

وہ تبِ عشق تمنّا ہے کہ پھر، صورتِ شمع — شعلہ، تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی — لکھ دیجیو، یارب، اُسے قسمت میں عدُو کی

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے — کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا — کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بن گیا تیغ نگاہِ یار کا سنگِ فساں — مرحبا! میں، کیا مُبارک ہے گراں جانی مجھے

یاد ہے، شادی میں بھی، ہنگامۂ "یارب"، مجھے — سُبحۂ زاہد ہوا ہے، خندہ زیرِ لب، مجھے

رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر — غرض شستِ بُتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں ذریعۂ راحت، جراحتِ پیکاں — وہ زخمِ تیغ ہے، جس کو کہ دلکُشا کہیے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی — مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات — ہاں، درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے — دیکھوں، اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بسرچشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرآب اُگاتا ہے مجھے

مُدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں، کہ ابھی کام بہت ہے

حدیثِ رشک

تُو اور سُوئے غیر نظرہائے تیز تیز
مَیں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اِک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

تُو دوست کسی کا بھی، سِتمگر، نہ ہوا تھا
اَوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

قاصد کو، اپنے ہاتھ سے، گردن نہ ماریے
اُس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصُور تھا

رشک کہتا ہے کہ "اُس کا غیر سے اخلاص حیف!"
عقل کہتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا؟"

ذِکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب؟
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا!

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
یارب، اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کُشتۂ دشمن ہوں آخر، گرچہ تھا بیمارِ دوست

غیر یُوں کرتا ہے میری پُرسش اُس کے ہجر میں
ق
بے تکلّف دوست ہو، جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک
مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شِکوۂ ضعفِ دماغ
سر کرے ہے وہ، حدیثِ زلفِ عنبربارِ دوست

چُپکے چُپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے، کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

تری طرف ہے بحسرت، نظارۂ نرگس
بکورئ دل و چشمِ رقیب، ساغر کھینچ

کیوں جل گیا نہ، تابِ رُخِ یار دیکھ کر؟
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں
تکلف برطرف! مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر

تُو اور آرائشِ خَمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور و دراز

رُخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع
ہوئی ہے آتشِ گل، آبِ زندگانیِ شمع

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا؟ کہ آج
گردِ ساحل، ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو
رکھتا ہو، مثلِ سایۂ گل، سر بپائے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لیے، بہار
میرا رقیب ہے نفَسِ عطر سائے گل

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ "جاؤں کدھر کو میں"؟

جانا پڑا رقیب کے دَر پہ ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہ گذر کو میں

ہو گئی ہے، غیر کی شیریں بیانی کارگر
عشق کا اُس کو، گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

تیرے جواہرِ طرفِ کُلہ کو کیا دیکھیں؟
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زُلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، اور کو آزمائے کیوں؟

رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں، خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی؟" یہ جو کہا، تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یُوں

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

نہیں گر ہمدمی آساں، یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی خدایا! آرزوئے دوست دشمن کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں
نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دَم ہے ہم کو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے، ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

یا میرے زخمِ رشک کو رُسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسّمِ پنہاں اُٹھائیے

غیر کے مرگ کا غم کس لیے، اے غیرتِ ماہ؟ ؎[1] ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا، اللہ سہی
ہم بھی دُشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی
گزرا، اسدؔ، مسرّتِ پیغامِ یار سے قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے
دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟
اُس کی بزم آرائیاں سُن کر، دلِ رنجور، یاں مثلِ نقشِ مدّعائے غیر، بیٹھا جائے ہے
گرچہ ہے کس کس کی بُرائی سے، ولے با ایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
مرجاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک آغوشِ خمِ حلقۂ زُنّار میں آوے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدُو کیا ہے؟
نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بآغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
غیر پھرتا ہے لیے یُوں ترے خط کو کہ اگر کوئی پُوچھے کہ "یہ کیا ہے" تو چُھپائے نہ بنے
ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے مرتے ہیں، ولے اُن کی تمنّا نہیں کرتے
دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے
رہے ہے یوں گہ و بیگہ، کہ کوئے دوست کو اب اگر نہ کہیے کہ دُشمن کا گھر ہے، کیا کہیے
یارب، اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے؟ رشک، آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے
تکلّف برطرف، نظّارگی میں بھی سہی لیکن وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے
قیامت ہے، کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر، غالبؔ وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے
نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا کیوں کر کہوں: "لو نام نہ اُن کا میرے آگے"؟

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۴، نسخۂ عرشی، حصّہ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۱۱

تمہاری طرز و روش، جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

رہا بلا میں بھی، میں، مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے، ادا تیری، اِک جہاں کے لیے

وہم و بدگمانی

بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا، خواب میں آکر تبسّم ہائے پنہاں کا

لے تو لوں سوتے میں اُس کے پانو کا بوسہ، مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرۂ عرق، دیدۂ حیراں سمجھا

ہوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

کیا بدگماں ہے مجھ سے! کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے، زنگار دیکھ کر

ہے بسکہ ہر اِک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

جلے ہے، دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع؟

ظالم، مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟
ساقی نے کچھ مِلا نہ دیا ہو شراب میں

ہے ہے! خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے؟

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو، اگر نامہ بر ملے

ہم سے عبث ہے، گمانِ رنجشِ خاطر
خاک میں عُشّاق کی غبار نہیں ہے

خطر ہے رشتۂ اُلفت، رگِ گردن نہ ہو جاوے
غرورِ دوستی آفت ہے، تو دشمن نہ ہو جاوے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر، نہ ہوتا کاشکے
اِس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

بلغ، پاکِ خفقانی، یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل، افعی نظر آتا ہے مجھے

آبگینۂ حسرت

نہ دے نامے کو اتنا طول، غالبؔ، مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر، یارب، ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، غالبؔ
یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت؟

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار، مرے آئنے سے جوہر کھینچ

مند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، ہے ہے!
خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے، اے شعلے
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع

حسرت! اے ذوقِ خرابی، کہ وہ طاقت نہ رہی
عشقِ پُر عربدہ کی گوں، تنِ رنجور نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر، گھر میں خاک نہیں

دے داد، اے فلک، دلِ حسرت پرست کی
ہاں، کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ؟
دل، فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے، کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض، کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے
شوق، گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

صد حیف! وہ ناکام کہ اک عمر سے، غالبؔ ق
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

کبھی تو اس سرِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت، کیا کروں؟
آرزو سے ہے، شکستِ آرزو مطلب مجھے

بے خودی

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گِلہ کیا؟

پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا، وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح؟"
دیکھ کے میری بیخودی، چلنے لگی ہوا کہ یوں

ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا، ہے نشانی میری

بے خودی، بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے، سایے کی طرح، میرا شبستاں مجھ سے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت، کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

حرفِ وفا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دہر میں نقشِ وفا، وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے، یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ، مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق، گو مجھے کافر کہے بغیر

کیونکر اُس بُت سے رکھوں جان عزیز؟
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز؟

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے، وگرنہ مُراد امتحاں نہیں

اُس فتنہ خُو کے در سے اب اُٹھتے نہیں، اسدؔ — اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

وفاداری بشرطِ اُستواری اصلِ ایماں ہے — مرے بتخانے میں، تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے — کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

ہے، بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر — غالبؔ، ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، سو وہ بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا، غلط بردار ہے

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی

جان تم پر نثار کرتا ہوں — مَیں نہیں جانتا، دُعا کیا ہے؟

خطِ عارض سے لکھا ہے، زلف کو اُلفت نے، عہد — یک قلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال — ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا، کہیے

تسلیم و رضا

دے وہ جس قدر ذلّت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا، اُن کا پاسباں، اپنا

چشمِ ما روشن، کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے — دیدۂ پُرخوں ہمارا، ساغرِ سرشارِ دوست

بوسہ نہیں، نہ دیجیے، دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

بزم میں اُس کے رُوبرو، کیوں نہ خموش بیٹھیے — اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدّعا کہ یوں

کسی کو دے کے دل، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟ — نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ "تکیہ کلام" — اب اُس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

ہم بھی تسلیم کی خُو ڈالیں گے — بے نیازی، تری عادت ہی سہی

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا، غالبؔ — خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

گلہ و شکوہ

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟ ق کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں، اِک دیدۂ بے خواب تھا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گِلہ کیا؟

سُن، اے غارت گرِ جنسِ وفا، سُن
شکستِ قیمتِ[1] دِل کی صدا کیا؟

کیا وُہ نمرُود کی خدائی تھی؟
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ "یہ بے ننگ و نام ہے"
یہ جانتا اگر، تو لُٹاتا نہ گھر کو مَیں

وائے! محرومیِ تسلیم و بدا! حالِ وفا
جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

تمہیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بُتوں کی ہو اگر ایسی ہی خُو، تو کیونکہ ہو

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مِرے دل سے، کہ اس میں آگ دبی ہے

ہے کچھ ایسی ہی بات، جو چُپ ہوں
ورنہ، کیا بات کر نہیں آتی

مَیں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہُوں
کاش! پُوچھو کہ مدّعا کیا ہے؟

ہم کو اُن سے وَفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے، وَفا کیا ہے؟

سختی کشانِ عشق کی، پُوچھے ہے کیا، خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا اَلَم ہوئے

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

پُر ہوں مَیں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے، کیا ہوتا ہے

○

---

[1] نسخۂ حمیدیہ میں قیمت کی جگہ شیشہ درج ہے،

طعن و تشنیع

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق؛ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ! اِس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
کبھی جو یاد بھی آتا ہوں مَیں تو کہتے ہیں کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"
نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب، بخیہ جیب و دامن میں
کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی"؟ بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو"؟
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟ بس چُپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زباں ہے
ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں، یہ خُو؟ دینے لگا ہے بوسہ، بغیر التجا کیے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے؟
داغِ دل گر نظر نہیں آتا بُو بھی اے چارہ گر، نہیں آتی؟
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
چاہتے ہیں خوبرُویوں کو اسدؔ، ق آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بِن آئے نہ رہے تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے
دل لگا کر آپ بھی، غالبؔ مجھی سے ہو گئے عشق سے آتے تھے مانع، میرزا صاحب مجھے
کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر ابھی اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد جنونِ ساختہ و فصلِ گل، قیامت ہے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے، تم — بارے، طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

کہاں میخانے کا دروازۂ غالبؔ اور کہاں واعظ — پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

واعظ، نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

عشقِ کامراں

مَیں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

دیکھنا حالت مرے دل کی، ہم آغوشی کے وقت — ہے نگاہِ آشنا، تیرا سرِ ہر مُو مجھے

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ، پسند آئی ہے — ہر غنچے کا گُل ہونا، آغوش کشائی ہے

ہے، وصل ہجر، عالمِ تمکین و ضبط میں — معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

اُس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو، ہاں — شوقِ فضول و جراتِ رندانہ چاہیے

حریمِ ناز
بلائے جاں ہے غالبؔ، اُس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، اَدا کیا،

خیر مقدم

نہیں ہے سایہ، کہ سُن کر نوید مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر، درودیوار

وہ آرہا مرے ہمسایے میں، تو سایے سے
ہوئے فدا درو دیوار پر، درودیوار

تو ہوا جلوہ گر، مُبارک ہو
ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز

جلوہ گہ یار

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا، خُلد میں گر، یاد آیا

گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے، سنگِ آستاں اپنا

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہوجانا؟

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشا ہے، ولے اِس قدر آباد نہیں

واں پہنچ کر، جو غش آتا ہے پئے ہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن، خدا کرے، وہ ترا جلوہ گاہ ہو

تیرے کوچے کا ہے مائل، دلِ مضطر میرا[1]
کعبہ ایک اور سہی، قبلہ نُما اور سہی

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

دل، پھر، طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منّتِ درباں کیے ہوئے

نظّارۂ جمال

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشا، ترے جلوے نے
کرے جو، پرتوِ خرشید، عالم شبنمستاں کا

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۴، نسخہ عرشی، حصّہ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۱۱

جلوہ، از بسکہ، تقاضائے نِگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

نہ ہو، حُسنِ تماشا دوست، رسوا بے وفائی کا
بہ مُہرِ صد نظر ثابت ہے، دعویٰ پارسائی کا

اے دلِ ناعاقبت اندیش، ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست؟

ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مئے جلوہ
کہ مست ہے ترے کُوچے میں ہر در و دیوار

ترے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دَوڑے ہے گل در قفائے گل

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے[1]
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟
کہ غیرِ جلوۂ گل، رہ گزر میں خاک نہیں

نظّارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حُسن کا؟
جوشِ بہار، جلوے کو جس کے نقاب ہے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق، ہاں، اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

وہ گُل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گُل کا، صدائے خندۂ دل ہے

جلوے کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

خوشا! اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا، ہم، گِلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ، پھر، رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر، ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

---

[1] بعض شارحین نے 'آے' کے بجائے 'آئیں' تحریر کیا ہے۔

اِک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر نگاہ
چہرہ، فروغِ مے سے، گلستاں کیے ہوئے

جمالِ دوست

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
رُوبرُو کوئی بُتِ آئنہ سیما نہ ہوا

باغِ شگفتہ، تیرا بساطِ نشاطِ دل،
اَبرِ بہار، خُم کدہ کِس کے دماغ کا؟

یُوسف اُس کو کہوں، اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے، تو مَیں لائقِ تعزیر بھی تھا

چھوڑا، مہِ نخشب کی طرح، دستِ قضا نے
خورشید ہنوز، اس کے برابر نہ ہوا تھا

آئینہ دیکھ، اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو، دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

نہ چھوڑی حضرتِ یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

جب وہ جمالِ دلفروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

ہو کے عاشق، وہ پری رُخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

تسکیں کو ہم نہ روئیں، جو ذوقِ نظر ملے
حُورانِ خُلد میں تری صورت، مگر ملے

حُسنِ مہ، گرچہ بہ ہنگامِ کمال، اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خُرشید جمال اچھا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تُند خُو کیا ہے

سچ کہتے ہو، خود بین و خود آرا ہوں، نہ کیوں ہوں؟
بیٹھا ہے بُتِ آئنہ سیما مرے آگے

آئینہ کیوں نہ دُوں، کہ تماشا کہیں جسے؟
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

سراپائے محبوب

سبزۂ خط سے ترا کاکُلِ سرکش نہ دَبا
یہ زُمُرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرۂ خوں، دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

کم نہیں نازشِ ہم نامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

تھا گریزاں مژۂ یار سے، دل، تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
مَیں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دِل سے مِٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جُدا ہو جانا

آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست
دُودِ شمعِ کُشتہ تھا شاید، خطِ رُخسارِ دوست

اَبرُو سے ہے کیا، اُس نگہِ ناز کو، پیوند؟
ہے تیر مقرّر، مگر اُس کی ہے کماں اور

نہ لیوے گر خسِ جوہر، طراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں، روئے نگار، آتش

حلقے ہیں، چشم ہائے کُشادہ بسوئے دل
ہر تارِ زلف کو نگہِ سُرمہ سا کہوں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرَم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے، یک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

دِل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن میں
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اِک شکن پڑی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایک چُرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں

نفی سے کرتی ہے، اثبات، تراوش، گویا
دی ہے جائے دہن اُس کو دمِ ایجاد نہیں

نیند اُسکی ہے، دماغ اُسکا ہے، راتیں اُسکی ہیں
تیری زُلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں، یارب، دل کے پار؟
جو مری کوتاہیِ قسمت سے، مژگاں ہو گئیں

دل میں ہے، یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حال آنکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے، ہر قطرہ خوں، تن میں

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر، کہ مجھ کو قرار
یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو، تو کیونکہ ہو

چشمِ خوباں، خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سُرمہ، تو کہوے کہ دُودِ شعلۂ آواز ہے

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اِک ادا میں رضامند کر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تُو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئنہ گفتار میں آوے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
تمہارے آئیو، اے طرہ ہائے خم بہ خم، آگے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا، کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے؟

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچ مدانی میری

اچھا ہے سرِ انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے اِک بُوند لہُو کی

میکدہ، گر چشمِ مستِ ناز سے پاوے شکست
مُوئے شیشہ، دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

کیے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

عارضِ گل دیکھ، روئے یار یاد آیا، اسدؔ
جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

پُتارہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پُرشکن کی آزمائش ہے؟

کٹے، تو شب کہیں، کاٹے، تو سانپ کہلاوے[۱]
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے؟

بھرم کھل جائے، ظالم، تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جُنبانی
قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

تکلّف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخویاں[۲]
نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیزِ عُریاں ہے

خوشیوں میں "تماشا ادا" نکلتی ہے
نگاہ، دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

---

۱ شرح بیخود دہلوی ص ۲۷۷، نسخۂ عرشی، حصّہ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۱۱،
۲ بعض شارحین نے "خُوباں" کے بجائے "خُوباں" تحریر کیا ہے۔

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ
کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

جس جا نسیم، شانہ کشِ زلفِ یار ہے
نافہ، دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے

منظور تھی یہ شکل، تجلّی کو نور کی
قسمت کھلی، ترے قد و رخ سے ظہور کی

مانگے ہے، پھر، کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے، پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو،
سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

خرامِ ناز

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے
صورتِ نقشِ قدم، ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے، تیری رفتار دیکھ کر

اگر وہ سرو قد، گرمِ خرامِ ناز آجاوے
کفِ ہر خاکِ گلشن، شکلِ قمری، نالہ فرسا ہو

دیکھو تو، دلفریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

دل، ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

چال، جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے، جا کرے کوئی

نزاکت

ہے کیا جو کَس کے باندھیے ہمیری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں،

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں؟
دُکھتے ہیں، آج، اُس بُتِ نازک بدن کے پانو

اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خُدا کا شکر
[1] اُٹھا سکا نہ، نزاکت سے گل بدن تکیہ

اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں، تو کیا
ہاتھ آویں، تو اُنہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۳، نسخۂ عرشی، حصّۂ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۰۱،

شرم وحیا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع، خارِ کسوتِ فانوس تھا

کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

غیر کو، یارب، وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

کرشمۂ حُسن

بُوئے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

قطرۂ مے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے، سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر، دل و جاں اور

دیکھ کر تجھ کو، چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس

فروغِ حُسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے، نکالے گر نہ خار آتش

سطوت سے تیرے جلوۂ حُسنِ غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں، رنگِ ادائے گل

ہو گئے ہیں جمع، اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے، اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پرافشاں جوہرِ آئینے میں، مثلِ ذرّہ روزن میں

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں، تجھ سے
آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں، مجھ سے

وہ نیشتر سہی، پہ دل میں جب اُتر آوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

بزمِ مے، وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا؟
شیشے میں نبضِ پری، پنہاں ہے موجِ بادہ سے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ، باندازِ گل، آغوش کشا ہے

سادگی و پُرکاری

سادگی و پُرکاری، بے خودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

سادہ و پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے، اے خُدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں بھی تلوار بھی نہیں

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو
ہَیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

سادگی پر اُس کی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ 'مفت آئے، تو مال اچھا ہے

ناز و ادا

کہتے ہو: "نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا"
دل کہاں کہ گم کیجے؟ ہم نے مدعا پایا

شمارِ سُبحہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

بلائے جاں ہے، غالبؔ، اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

دل اُس کو، پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے
ہمیں دماغ کہاں، حُسن کے تقاضا کا؟

کافی ہے نشانی، ترا چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے، بوقتِ سفر، انگشت

اسے ترا غمزہ، یک قلم انگیز
اسے ترا ظلم، سربسر انداز

بسکہ ہیں، ہم، اِک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا، گرد اپنے مدفن میں نہیں

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آ سکا — گر ایک ادا ہو، تو اُسے اپنی قضا کہوں

دُشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ — تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

پُرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا؟ کہ بن کہے — اُس کے ہر ایک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

مزا ملے، کہو، کیا خاک ساتھ سونے کا؟ [1] — رکھے جو بیچ میں، وہ شوخ سیم تن، تکیہ

حُسن میں حوُر سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی [2] — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں — کھینچتا ہے جس قدر، اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

زہے کرشمہ، کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بن کہے بھی اُنہیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟

حُسنِ تغافل

ظلم کر ظُلم، اگر لُطف دریغ آتا ہو — تُو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ اُمید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سَم ہے مجھ کو

لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر — اب تک، وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

ہے شکستن سے بھی دل نومید، یارب کب تلک — آبگینہ، کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بُتاں محوِ تغافل، کیوں نہ ہو؟ — یعنی اِس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل، کہ کیوں اُٹھا؟ — گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی

تجاہلِ عارفانہ

بے نیازی حد سے گزری، بندہ پرور، کب تلک — ہم کہیں گے حالِ دل، اور آپ فرماویں گے "کیا؟"

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۳، نسخۂ عرشی، حصّہ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۰۳،

[2] " ص ۶۴ " " ص ۳۱۱،

تجاہلِ پیشگی سے مدّعا کیا؟ کہاں تک، اے سراپا ناز! "کیا؟ کیا؟"

پُوچھتے ہیں وہ کہ "غالب کون ہے"؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

کہوں جو حال، تو کہتے ہو: "مدّعا کہیے" تمھیں کہو کہ جو تم یُوں کہو، تو کیا کہیے

بے اِلتفاتی و بے اعتنائی

مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے؟ خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

لاگ ہو، تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ جب نہ ہو کچھ بھی، تو دھوکا کھائیں کیا؟

نہیں اقلیمِ اُلفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مُہر عنواں پر

مَیں اور صد ہزار نوائے جگر خراش تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا تعجب سے وہ بولا: "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"؟

جو آؤں سامنے اُن کے، تو "مرحبا" نہ کہیں جو جاؤں واں سے کہیں کو، تو "خیر باد" نہیں

دھوتا ہوں جب میں، پینے کو، اُس سیم تن کے پاؤ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤ

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے تکلف برطرف، تھا اک اندازِ جنوں وہ بھی

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا سُن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے، وہ میرے کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری

بجا ہے، اگر نہ سُنے نالہ ہائے بلبلِ زار کہ گوشِ گل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟ ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے

کیوں نہ ہو بے التفاتی؟ اُس کی خاطر جمع ہے جانتا ہے محوِ پرسشہائے پنہانی مجھے

خُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو معشوقی و بے حوصلگی، طُرفہ بلا ہے

بے نیازی

پُوچھ مت رُسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن
دستِ مرہونِ حنا، رُخسارِ رہنِ غازہ تھا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہ ہُوا

ہمیں پھر اُن سے اُمید، اور اُنہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پُوچھیں نہ وہ، تو کیونکر ہو؟

غالب، ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں، یہ اجارہ نہیں کرتے

غالب، تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا؟
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ، نہ سہی

حُسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئنہ، زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

شوخی و ستم ظریفی

مَیں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھُوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دَر پہ رہنے کو کہا، اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھُلا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دِل، دلستاں روانہ ہوا

کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
"جانوں کسی کے دل کی مَیں کیونکر" کہے بغیر

گھر جب بنا لیا ترے در پر، کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

مَیں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی"
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تُو غالب؟
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

مَیں اُنہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے، جو مے پیے ہوتے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ "سرِ رہگذر ہے کیا کہیے"؟

بیوفائی

دہانِ ہر بُتِ پیغارہ جُو، زنجیرِ رُسوائی — عدم تک بیوفا، چرچا ہے تیری بے وفائی کا

دل دیا جان کے، کیوں اُس کو وفادار، اسدؔ — غلطی کی کہ جو کافر کو مسلمان سمجھا

تا کرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو — دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

جو مُنکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے؟ — کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اُٹھے تھے سیرِ گُل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

پندار و نخوت

دیکھیے، لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ — اُس کی ہر بات پہ، ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

مَیں جو کہتا ہوں کہ "ہم لیں گے قیامت میں تمہیں" — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حُور نہیں"

اُلجھتے ہو تم، اگر دیکھتے ہو آئینہ — جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو، تو کیونکر ہو؟

ہے وہ غرورِ حُسن سے بیگانۂ وَفا — ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے

مجھے اُس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی — کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مِری کہانی

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تُو کیا ہے"؟ — تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

غُصّہ و عِتاب

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دُور نہیں

واں گیا بھی مَیں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب؟ — یاد تھیں جتنی دُعائیں، صَرفِ درباں ہو گئیں

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں، — پر کچھ اب کے سرگرانی اَور ہے

اللہ رے تندیِ خوئے حسن کے بیم سے
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

جور و جفا

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یادِ اسدؔ
جفا میں اُس کی، ہے اندازِ کارفرما کا

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام، ستم گر کہے بغیر

کیا آبروئے عشق، جہاں عام ہو جفا؟
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

مے خانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں
خمیازہ کھینچے ہے بتِ بے دادِ فن ہنوز

دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن، اے دل
نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

دھول دھپّا، اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے، غالبؔ پیش دستی ایک دن

جاں ہے بہائے بوسہ، و لے کیوں کہے ابھی؟
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خورشید و ماہ ہو

یہی ہے آزمانا، تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟
عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو

غمِ دنیا سے گر پائی بھی، فرصت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا، تقریب تیرے یاد آنے کی

بیدادِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر
ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلائے آسمانی اور ہے

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہو کہ مَیں
زلف گر بن جاؤں، تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم، آئینۂ تصویر نما ہے

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست، جاں کے لیے
رہی نہ طرزِ ستم کوئی، آسماں کے لیے

فلک، نہ دُور رکھ اُس سے مجھے، کہ میں ہی نہیں
درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لیے

سنگدلی

نہ نِکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو، تو کیونکر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا، پھر کہو، تو کیونکر ہو

یہ فتنہ، آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جسکے، دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے! واہ، واہ!
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

دُشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیے

ہم نشیں، مت کہہ کہ "برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست"
واں تو، میرے نالے کو بھی، اعتبارِ نغمہ ہے

عدالتِ حُسن

پھر کھُلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سر رشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدّمہ تھا
آج پھر اُس کی روبکاری ہے

دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ
نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

یادِ ماضی

دل تا جگر، کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں، جلوۂ گُل، آگے گرد تھا

وہ فراق اور وہ وصال کہاں؟
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں؟

فُرصتِ کاروبارِ شوق کسے؟
ذوقِ نظّارۂ جمال کہاں؟

دِل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا،
شورِ سودائے خطّ و خال کہاں؟

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں؟

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟
اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع، پھر، جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے، دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

رُودَادِ غم

خلشِ غمَزۂ خُونریز نہ پوچھ،
دیکھ خُونَنابہ فشانی میری

عنوان	صفحہ

نامہ و پیام

یہ جانتا ہوں کہ تُو اور پاسخِ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا

قاصد کے آتے آتے، خط اک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

دے کے خط، مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

اِلتجا

رحم کر ظالم، کہ کیا بُودِ چراغِ کُشتہ ہے
نبضِ بیمارِ وَفا، دُودِ چراغِ کُشتہ ہے

"ہاں، بھلا کر، ترا بھلا ہو گا"
اور درویش کی صَدا کیا ہے؟

اسدؔ ہے نزع میں، چل، بیوفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

وعدہ و قسم

ترے وعدے پر جیے ہم، تو یہ جان، جھُوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا
کبھی تُو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

یہ قاتل، وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا؟

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو، ستم گر، ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

تا پھر نہ، انتظار میں، نیند آئے عُمر بھر
آنے کا عہد کر گئے، آئے جو خواب میں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

سر اُڑانے کے، جو، وعدے کو مکرّر چاہا
ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

ضد کی ہے اور بات، مگر خُو بُری نہیں
بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے؟
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دَربانی مجھے

نہ جانوں، کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بد عہدی
تجھے کہ آئنہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بَسر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عُمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنّا کرے کوئی

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملّت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

کیفیّتِ انتظار

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار، تو آ
کہ ہیں دُکانِ متاعِ نظر، دَر و دیوار

وصالِ جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں؟
کہ دیجیے آئنۂ انتظار کو پَرداز

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو، کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

کہتے تو ہو تم سب کہ بُتِ غالیہ مُو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وُہ آئے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وُہی پردۂ عماری ہے

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

کِس کا سُراغِ جلوہ ہے، حیرت کو، اے خدا؟
آئینہ، فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

بہارِ غم کدہ

کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم؟ اندھیر ہے
پنبہ، نورِ صبح سے کم جس کے رَوزن میں نہیں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی؟
شبِ مہ ہو جو رکھوں پنبہ دیواروں کے رَوزن میں

ہے سبزہ زار، ہر درو دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو، پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور، آسمان ہے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

ہجر و فراق

کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا، لانا ہے جُوئے شیر کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا، اسدؔ — سینہ، کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوارِ جُو — واں وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بے خودی — جلوۂ گل، واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش، واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا — یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا — بے تکلف، داغِ مہ، مُہرِ دہاں ہو جائے گا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب — پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو — مجھے، دماغ نہیں، خندہ ہائے بے جا کا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

دردِ دل لکھوں کب تلک؟ جاؤں اُن کو دکھلادوں — اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

نظر میں کھٹکے ہے، بِن تیرے، گھر کی آبادی — ہمیشہ روتے ہیں ہم، دیکھ کر دَر و دیوار

مجھے اب، دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا — کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر

کب سے ہوں، کیا بتاؤں، جہانِ خراب میں؟ — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں، گر حساب میں،

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں — شبِ فراق سے، روزِ جزا، زیاد نہیں

جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق — میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

مجھے جنوں نہیں، غالبؔ، ولے، بقولِ حضور، — فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا — کہ سانپ فرش ہے، اور سانپ کا ہے من تکیہ[1]

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۳، نسخہ عرشی، حصہ سوم، یادگار نالہ ص ۳۰۳

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراق
تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

فردا و دَی کا تفرقہ یک بار مِٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دُود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت، ہے ہے!
سایۂ خُرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بطوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر، تارِ بستر ہے

یہ ضد کہ آج نہ آوے، اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے، کیا کہیے!

وہ آویں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمایش ہے

مت پُوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تُو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

نغمۂ اشک

دل میں پھر گریہ نے اِک شور اُٹھایا، غالبؔ
آہ، جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا

نہیں معلوم، کِس کِس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے، سرشک آلُودہ ہونا تیری مژگاں کا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش، کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گُل نے کیا تھا واں چراغاں، آبِ جُو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

مَیں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے
اُس کے سَیلِ گریہ میں، گردُوں کفِ سیلاب تھا

ایک ایک قطرے کا، مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
دَر و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے
مری نگاہ میں ہے، جمع و خرچ دَریا کا

بے خونِ دل ہے چشم میں، موجِ نگہ، غبار
یہ میکدہ، خراب ہے مَے کے سُراغ کا

توفیق باندازۂ ہمت ہے، ازل سے
اے عافیت، کنارہ کر، اے انتظام چل
ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
برشگالِ گریۂ عاشق ہے، دیکھا چاہیے
یونہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا، خانہ ویرانی
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار
دستگاہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
رونے سے، اور عشق میں بیباک ہو گئے
رونے سے، اے ندیم، ملامت نہ کر مجھے
ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
غالبؔ، ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر، در و دیوار
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار
ہوتے جو کبھی دیدۂ خونابہ فشاں اور
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
رنگ ہو کر اڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں
کھل گئی مانندِ گل، سو جا سے دیوارِ چمن
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں
کفِ سیلاب باقی ہے، برنگِ پنبہ روزن میں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟
پاسِ بے رونقیِ دیدہ، اہم ہے ہم کو
یک بیاباں جلوۂ گل، فرشِ پا انداز ہے
جب لختِ جگر، دیدۂ خوں بار میں آوے
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے
دیکھ خونابہ فشانی میری
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

بلاسے، اگر مژۂ یارِ تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لیے

شُعلہ نوائی

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طُعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جانگداز کا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بےتاب تھا

نالۂ دل نے دیے، اوراقِ لختِ دل بباد
یادگارِ نالہ، اک دیوانِ بےشیرازہ تھا

سینے کا داغ ہے، وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے، وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا! ظالم
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ
تارِ نفس، کمندِ شکارِ اثر ہے آج

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

دل میں آجاتے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رَسا کہتے ہیں

مت مَردُمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع، سویدائے دل و چشم میں، آہیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بُلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

بسکہ روکا میں نے، اور سینے میں اُبھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہوگئیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خُدا کو مان
آخر، نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں

واں اُس کو ہولِ دل ہے، تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی، یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو

نہ کرتا کاش نالہ! مجھ کو کیا معلوم تھا، ہمدم
کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں، وہ بھی

آگ سے، پانی میں بُجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی، درماندگی میں، نالے سے مجبور ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی بَردِ لَیالی نے مجھے

نالے عدم میں، چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے، سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

واں کنگرِ استغنا، ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

ہجوم نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے
خموشی، ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفَس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

قمری کفِ خاکستر و بلبل، قفسِ رنگ
اے نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے؟

وہ تپ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع
شعلہ تا نبضِ جگر شعلہ نوائی مانگے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
میں نہیں جلتا، نفس ہر چند شعلہ بار ہے

ضعف و ناتوانی

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے، حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

دماغ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا؟

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی
ہر قدم، سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل
نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا

مرنے کی، اے دل، اَور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مضمحل ہو گئے قُویٰ، غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں؟

ہوں فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے؟
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت، بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

گنجایشِ عداوتِ اغیار یک طرف
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا

ضعف سے، نقشِ پئے مور، ہے طوقِ گردن
اگرچہ پھینک دیا تم نے دُور سے، لیکن [1]

لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب

کردیا ضعف نے عاجز غالبؔ
لاغر اِتنا ہوں کہ گر تُو بزم میں جا دے مجھے

کیا تعجب ہے جو اُس کو دیکھ کر آجائے رحم؟

یاں دل میں، ضعف سے، ہوسِ یار بھی نہیں
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو
اُٹھائیے کیونکہ، یہ رنجورِ خستہ تن ہمکیہ

مری طاقت، کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی
لب تک آتا ہے، جو ایسا ہی رُسا ہوتا ہے

ننگِ پیری ہے جوانی میری
میرا ذمّہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

عالمِ کشمکش

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش، تو کیا کیجے؟

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے؟
شوق کو یہ لَت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
تُو وہ بدخُو کہ تحیّر کو تماشا جانے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سُنائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو
حیا ہے اور یہی گو مگو، تو کیوں کر ہو؟

نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟
دل کی وہ حالت، کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۳، نسخۂ عرشی، حصّہ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۰۳

وہ بدخُو، اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پُوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

ہُوتے ہیں پاؤں پہلے ہی نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کُفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

آزمائش

دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسفؑ کے بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سُبحہ و زنّار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں، شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

توجّہ و التفات

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گو نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تُو راضی ہوا
مجھ پہ گویا، اِک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

مہرباں ہو کے بُلا لو مجھے، چاہو جس وقت
مَیں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے، اگر مہرباں نہیں

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم، مگر تمہیدِ جانے کی

درماندگی و بیچارگی

تمنّائے زباں، محوِ سپاسِ بے زبانی ہے
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

درماندگی میں، غالبؔ، کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کُشا تھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

لیتا، نہ اگر دل تمہیں دیتا، کوئی دم چین
کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش
مجبور یاں تلک ہوئے، اے اختیار حیف

ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمارخانۂ عشق
واں جو جاویں، گرہ میں مال کہاں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

مزے جہان کے، اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر، ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں، بال و پر میں خاک نہیں

مئے عشرت کی خواہش، ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں، وہ بھی

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

دل ہی تو ہے، سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں، اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

زخمی ہوا ہے، پاشنہ پائے ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے؟
داغ، پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا، ہمارا جو قدم منزل میں ہے

کہاں تک روؤں اُس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

اگر یہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
ہائے! کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے؟
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسی کی

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پانو ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

ناکامی و محرومی

بفیضِ بے دلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
زندگی یُوں بھی گزر ہی جاتی
دیکھ کر غیر کو، ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا؟
حاصلِ اُلفت نہ دیکھا جُز شکستِ آرزُو
عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
وہ نالہ، دل میں خَس کے برابر جگہ نہ پائے
وہ سحر، مدّعا طلبی میں نہ کام آئے
آہ کا کِس نے اثر دیکھا ہے؟
غلطی ہائے مضامیں مت پُوچھ
دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں مَیں
کیوں گردشِ مُدام سے گھبرا نہ جائے دل
بھلا اُسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
ہمارے ذہن میں اُس فکر کا ہے نام وصال
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزُردہ کو بخشے؟
کُھلے گا کِس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب
حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی
وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ، اے ہمدم
کوئی دن گر زندگانی اَور ہے
نہ مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال

کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا؟
نالہ کرتا تھا، وَلے طالبِ تاثیر بھی تھا
دل بدل پیوستہ، گویا، یک لبِ افسوس تھا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں
جس سحر سے سفینہ رَواں ہو سراب میں
ہم بھی ایک اپنی ہوا باندھتے ہیں
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں مَیں
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں مَیں
اثر، مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
کہ گر نہ ہو، تو کہاں جائیں، ہو، تو کیونکر ہو
مرے دامِ تمنّا میں ہے اِک صیدِ زبوں، وہ بھی
قسم کھائی ہے اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
دل، جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اَسامی
اثر فریادِ دل ہائے حزیں کا کِس نے دیکھا ہے؟
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
مدّت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزُو کیا ہے؟

ہر قدم، دُوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے، بھاگے ہے بیاباں مُجھ سے

دِکھا کے جنبشِ لب ہی، تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزُو رہ جائے گی
وائے! ناکامی، کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

غدایا، جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے؟
کہ جتنا کھینچتا ہوں، اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

چاکِ جگر سے، جب رہِ پُرسش نہ وا ہوئی
کیا فائدہ کہ جَیب کو رُسوا کرے کوئی

لختِ جگر سے ہے، رگِ ہر خار، شاخِ گل
تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیِ نِگاہ، ہے برقِ نظّارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کِسی کا گِلہ کرے کوئی

شعلے سے نہ ہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی، کِس قدر افسُردگیِ دل پہ جلا ہے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں؟
ہَیں نہیں جلتا نفس ہر چند آتشبار ہے

ذِلّت و رُسوائی

ہوئے ہم جو مر کے رُسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا؟
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

کی، ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

اِس رنگ سے اُٹھائی کل اُس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

نِکلنا خُلد سے آدم کا سُنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرُو ہو کر، ترے کوچے سے ہم نکلے

گدا سمجھ کے وُہ چپ تھا، مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم، میں نے پاسباں کے لیے

خانہ ویرانی

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے، میرے درباں کا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو، ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا، تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں، اور گھر میں بہار آئی ہے

جنوُن و وحشت

بسکہ ہوں غالب، اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
مُوئے آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں؟
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا، کہ صحرا جل گیا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے، نقشِ قدم میرا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں
ذرہ ذرہ، روکشِ خرشیدِ عالم تاب تھا

وائے دیوانگیِ شوق! کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جاویں گے کیا

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

سر پھوڑنا وہ، غالب شوریدہ حال کا
یاد آگیا مجھے، تری دیوار دیکھ کر

نہ لڑ ناصح سے، غالب کیا ہوا، گر اُس نے شدت کی؟
ہمارا بھی تو آخر، زور چلتا ہے گریباں پر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرّد بھی، مجھے داغِ پلنگ آخر

جُنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عُریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

نہ پُوچھ وسعتِ میخانۂ جُنوں، غالب
جہاں یہ کاسۂ گردُوں ہے ایک خاک انداز

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقش پا میں ہے تبِ گرمیِ رفتار ہنوز

مر گیا پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی، ہے ہے!
بیٹھنا اُس کا وہ، آ کر، تری دیوار کے پاس

آبرو کیا خاک اُس گُل کی، کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

نقصاں نہیں، جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکّر ہے مرے پانو میں، زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو، کہ جہاں
جادہ، غیر از نگہِ دیدۂ تصویر، نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش، کہ گھر یاد نہیں

دیوانگی سے، دوش پہ زُنّار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر، وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا، کوئی دیوار بھی نہیں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سُوَیدا ہو گیا، ہر قطرہ خوں، تن میں

خدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں، جنبشِ جوہر نے آہن کو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی، کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے، اندر کفن کے، پانو

ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرف، اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے، تو جنگل اُداس ہے

وحشت پہ میری، عرصۂ آفاق، تنگ تھا
دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

پھر جگر کھودنے لگا، ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پس از مُردن بھی، دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے
شرارِ سنگ نے تُربت پہ میری گل فشانی کی

پابدامن ہو رہا ہوں، بسکہ، میں صحرانورد
کانٹوں کی زباں سُوکھ گئی پیاس سے یارب
تب چاکِ گریباں کا مزا ہے، دلِ ناداں
خدا کے واسطے! داد اس جنونِ شوق کی دینا
چپک رہا ہے بدن پر لہُو سے، پیراہن
اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں
چاک کی خواہش، اگر وحشت بعریانی کرے
ہوتا ہے نہاں گرد میں، صحرا مرے ہوتے
ہر سنگ و خشت، ہے صدفِ گوہرِ شکست
بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم

خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
ایک آبلہ پا وادیِ پُرخار میں آوے
جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے، ہم آگے
ہمارے جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟
صورتِ رشتۂ گوہر، ہے چراغاں مجھ سے
صبح کے مانند، زخمِ دل، گریبانی کرے
گھستا ہے جبیں خاک پہ، دریا، مرے آگے
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی
کچھ نہ سمجھے خُدا کرے کوئی
برسوں ہوئے ہیں، چاک گریباں کیے ہوئے

ذوقِ اسیری

خانہ زادِ زلف ہیں، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
قید میں ہے، ترے وحشی کو وُہی زلف کی یاد
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیّاد
مژدہ اے ذوقِ اسیری! کہ نظر آتا ہے
اسدؔ، زندانیِ تاثیرِ اُلفت ہائے خوباں ہوں
خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو

ہیں گرفتارِ وفا، زنداں سے گھبراویں گے کیا
ہاں کچھ اک رنجِ گراں باریِ زنجیر بھی تھا
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
دامِ خالی، قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
خمِ دستِ نوازش، ہو گیا ہے طوق گردن میں
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ooo

پاداشِ عمل

دل لگا کر، لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا
بارے، اپنی بے کسی کی ہم نے پائی داد، یاں

ان پری زادوں سے لینگے خُلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے، یہی، حُوریں اگر واں ہو گئیں

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تمُ گواہ ہو

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر
آخر، ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

نکوہش ہے سزا فریادیِ بیدادِ دلبر کی
مُبادا، خندۂ دنداں نما ہو، صبحِ محشر کی

بے اعتدالیوں سے، سُبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے، اُتنے ہی کم ہوئے

دیتے ہیں جنّت، حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ، باندازۂ خُمار نہیں ہے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل؟
بارے، اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رہیگا اُس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

داغِ عشق

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اِک تخم ہے سَروِ چراغاں کا

جاری تھی، اسدؔ، داغِ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ، جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہُوں مَیں اِک دَاغِ نہاں اور

فارغ مجھے نہ جان، کہ مانندِ صبح و مہر
ہے، داغِ عشق، زینتِ جیبِ کفن ہنوز

ہے داغِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر
ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز

نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پُوچھ
شگفتگی، ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

سُراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے
کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازُو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں

جز نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

یاد و یاد دہانی

تُو مجھے بھول گیا ہو، تو پتا بتلا دُوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

ثمرۂ شہادت

عَلَی الرّغمِ دُشمن شہیدِ وَفا ہُوں
مُبارک، مبارک، سلامت سلامت

شہادت تھی مری قسمت میں، جو دی تھی یہ خُو مجھکو
جہاں تلوار کو دیکھا، جھکا دیتا تھا گردن کو

اِک خونچکاں کفن میں کروروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

پشیمانی و ندامت

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

جوَر سے باز آئے، پر باز آئیں کیا؟
کہتے ہیں: "ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا"؟

پئے نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے
شرمندگی سے عُذر نہ کرنا گُناہ کا

کس پردے میں ہے آئنہ پرداز؟ اے خدا
رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

کعبے کس مُنہ سے جاؤ گے، غالب؟
شرم تُم کو مگر نہیں آتی؟

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا
کُریدتے ہو جو اَب راکھ، جستجو کیا ہے؟

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے ——— جفائیں کر کے اپنی یاد، شرما جائے ہے مجھ سے

مرثیہ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور ——— تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا ——— ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل، اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں" ——— مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: "قیامت کو ملیں گے" ——— کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں، اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف ——— کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور؟

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے ——— پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور؟

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے؟ ——— کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی، نیّر سے لڑائی ——— بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور؟

گزری نہ، بہر حال، یہ مدّت خوش و ناخوش ——— کرنا تھا، جواں مرگ، گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالب؟" ——— قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے! ——— کیا ہوئی ظالم، تری غفلت شعاری ہائے ہائے!

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ ——— تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری؟ ہائے ہائے!

کیوں مری غم خوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال؟ ——— دشمنی اپنی تھی، میری دوستداری، ہائے ہائے!

عمر بھر کا تُو نے پیمانِ وفا باندھا، تو کیا؟ ——— عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری، ہائے ہائے!

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی ——— یعنی، تجھ سے تھی اسے ناسازگاری، ہائے ہائے!

گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا؟ ——— خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری، ہائے ہائے!

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ——— ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری، ہائے ہائے!

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ——— اُٹھ گئی دُنیا سے راہ و رسمِ یاری، ہائے ہائے!

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اِک لگنے نہ پایا، زخمِ کاری ہائے ہائے!

کِس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال
ہے نظر، خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے!

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل، تس پر یہ نااُمیدواری، ہائے ہائے!

عشق نے پکڑا نہ تھا، غالبؔ، ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا، تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے!

رنگ و بو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

عنوان	صفحہ

نیرنگِ مناظر

شب ہُوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھُلا
اِس تکلّف سے کہ گویا بُتکدے کا دَر کھُلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم، ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھُلا

کہوں کس سے مَیں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بُری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نَو سے آغوشِ وداع

تھیں بناتُ النعشِ گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہو گئیں

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اِک داغِ نہاں اور

دکھائے گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

موجِ صبا

پوچھ مت وجہِ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے؟ اگر
ق
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو:
موجِ گُل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

آزادیِ نسیم مبارک! کہ ہر طرف
ٹُوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گُل

بھُوکے نہیں ہیں سَیرِ گلستاں کے ہم، وَلے
کیونکر نہ کھائیے؟ کہ ہوا ہے بہار کی

فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا، جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

جلوۂ بہار

تا کہ تجھ پر کھُلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئنے کا ہو جانا

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیِ کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

ہوش اُڑتے ہیں مرے، جلوۂ گل دیکھ اسدؔ — پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا، موجِ شراب

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق، حلقۂ بیرونِ در ہے آج

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف — اُڑتے ہوئے، اُلجھتے ہیں مُرغِ چمن کے پانو

مِینائے مے ہے سرو، نشاطِ بہار سے — بالِ تَدَرو، جلوۂ موجِ شراب ہے

آغوشِ گُل کشودہ برائے وداع ہے — اے عندلیب! چل کہ چلے دن بہار کے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گُل — کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

سمجھ اس فصل میں کوتاہیِ نشوونما، غالبؔ — اگر گُل، سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

ہاں، نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری، واہ! واہ! — پھر ہوا تازہ، سودائے غزل خوانی، مجھے

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب — شیشۂ مے، سروِ سبزِ جوئے بارِ نغمہ ہے

چھڑکے ہے شبنم، آئینۂ برگِ گل پر، آب — اے عندلیب، وقتِ وداعِ بہار ہے

اے عندلیب، یک کفِ خس بہرِ آشیاں — طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

آمد بہار کی ہے، جو بلبل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اِک خبر ہے زبانی طیور کی

بادَہ و سَاغر

بقدرِ ظرف ہے، ساقی، خمارِ تشنہ کامی بھی — جو تُو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اُچھل رہے — ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا

شبِ خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز انداز تھا — تا محیطِ بادہ، صُورت خانۂ خمیازہ تھا

مَیں اور بزمِ مے سے یُوں تشنہ کام آؤں — گر مَیں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی؟ — کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

حریفِ جوششِ دریا نہیں، خود داریِ ساحل — جہاں ساقی ہو تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے — سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما، موجِ شراب

جس قدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز
بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
موجۂ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال
نشے کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے زہے! موسمِ گل
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے
لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
سلطنت دست بدست آئی ہے
غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
کل کے لیے، کر آج نہ خسّت شراب میں
صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے
علاوہ عید کے، ملتی ہے اور دن بھی شراب
جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
ہے دورِ قدح، وجہ پریشانی صہبا
پی، جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت
ساقی گری کی شرم کرو، آج ورنہ ہم

دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب
شہپرِ رنگ سے ہے بال کُشا موجِ شراب
ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
رہبرِ قطرہ بدریا ہے، خوشا موجِ شراب
بُردئے سُفرہ، کبابِ دلِ سمندر کھینچ
مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل
موجِ مے کی آج، رگِ مینا کی گردن میں نہیں
جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں
یہ سوءِ ظن ہے، ساقیِ کوثر کے باب میں
وائے! وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
بلا سے، آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
گدائے کوچۂ مے خانہ نامُراد نہیں
سب لکیریں ہاتھ کی گویا، رگِ جاں ہو گئیں
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
اِس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
مدّت ہوئی ہے، دعوت آب و ہوا کیے
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بُو آئے

پرِ پروانہ، شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا
ہوئی، مجلس کی گرمی سے، روانی دَورِ ساغر کی

مے پرستاں، خُمِ مے مُنہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی، نہ سہی

تُو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالبؔ؟
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

وہ چیز، جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفامِ مُشک بُو کیا ہے؟

پیوں شراب، اگر خُم بھی دیکھ لُوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کُوزہ و سبُو کیا ہے؟

پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

کیوں بوتے ہیں باغباں تونبے؟
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد؟
مے ہے، یہ مگس کی قے نہیں ہے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ مے کشی
تھے یہ ہی دو حساب، سو یُوں پاک ہو گئے

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے؟
غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے؟

ہوئی اس دَور میں منسُوب مجھ سے، بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

درکار ہے شگفتنِ گُل ہائے عیش کو
صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

غم کھانے میں بودا، دلِ ناکام، بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یُوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

رِندی و مستی

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفَس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

نشّۂ رنگ سے ہے، واشدِ گُل
مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں؟

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

آزادہ رَوی

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

دَیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

کعبے میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں
بھُولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کُنشت کو

وارستگی بہانۂ بے گانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو

جب میکدہ چھُٹا، تو پھر کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

مسجد کے زیرِ سایہ، خرابات چاہیے
بھَوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات چاہیے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار، تو کعبے ہی کو ہو آئے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رَونق
نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

سَیر و سفر

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا، یعنی
ق
ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سَیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

تکیہ

شبِ وصال میں، مُونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

خراجِ بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟
کہ بن گیا ہے، خمِ جعدِ پرشکن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں، بستر [1] ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن، تکیہ
فروغِ حُسن سے روشن ہے خواب گاہ تمام جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن، تکیہ
غش آگیا جو پس از قتل، میرے قاتل کو ہوئی ہے اُس کو میری لاشِ بے کفن، تکیہ

---

[1] طاہر ایڈیشن ص ۶۲، ۶۳، نسخۂ عرشی، حصّۂ سوم، یادگارِ نالہ ص ۳۰۳،

در حدیثِ دیگراں

دیدہ تا دِل، اسدؔ، آئینۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

عنوان	صفحہ

غزلیات

قصائد

مثنویات

قطعات

رُباعیات

تہنیت بہادر شاہ ظفر

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے باد پیمائی
کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ — شاہِ دیندار نے شفا پائی

مدح

غالبؔ، خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز — دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ — فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو
غالبؔ، مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو؟ — پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں
غالبؔ بھی گر نہ ہو، تو کچھ ایسا ضرر نہیں — دنیا ہو، یارب، اور مرا بادشاہ ہو

ق

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن — شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے
اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم — تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے
سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے — تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے
ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں — یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

حضورِ شاہ میں، اہلِ سخن کی آزمایش ہے — چمن میں، خوشنوایانِ چمن کی آزمایش ہے

رَوندی ہُوئی ہے کوکبۂ شہریار کی — اِترائے کیوں نہ، خاک سرِ رہگزار کی

جب اُس کے دیکھنے کے لیے آئیں بادشاہ — لوگوں میں کیوں نمُود نہ ہو لالہ زار کی

دیا ہے خلق کو بھی، تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خُدایا، یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

نصیرِ دولت و دیں، اور معینِ ملّت و مُلک — بنا ہے چرخِ بریں، جس کے آستاں کے لیے

زمانہ عہد میں اُس کے، ہے محوِ آرایش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

قصائد

مدح

قصیدہ در منقبت حضرت علیؑ

(۱)

سازِ یک ذرّہ، نہیں، فیضِ چمن سے، بیکار ‏— سایۂ لالۂ بے داغ، سُویدائے بہار

مستیِ بادِ صبا سے ہے، بعرضِ سبزہ — ریزۂ شیشۂ مے، جوہرِ تیغِ کُہسار

سبز ہے جامِ زمرّد کی طرح، داغِ پلنگ — تازہ ہے، ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت — کہ اِس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا ہمہ، معمُوریِ شوقِ بلبُل — راہِ خوابیدہ ہوئی، خندۂ گُل سے، بیدار

سوزِ نے سے ہے فیضِ ہوا، صورتِ مژگانِ یتیم — سرنوشتِ دوجہاں ابر، بیک سطرِ غبار

کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو باندازِ ہلال — قوّتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بے کار

کفِ ہر خاک بگردوں شدہ، قمری پرواز — دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار

میکدے میں ہو، اگر آرزوئے گُل چینی — بھُول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

موجِ گُل ڈھونڈ، بخلوت کدۂ غنچۂ باغ — گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تُو، دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر — سبز، مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

لعل سے، کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا، منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل، ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلکُ العرش، ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل، سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کے خاشاک سے، حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا
چشمِ نقشِ قدم، آئینۂ بختِ بیدار

ذرہ اُس گرد کا، خورشید کو، آئینۂ ناز
گرد اُس دشت کی اُمید کو، احرامِ بہار

آفرینش کو ہے، واں سے طلبِ مستیِ ناز
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے، ہر موجِ غبار

فیض سے تیرے ہے، اے شمعِ شبستانِ بہار (مطلع)
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئنہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے، بروئے گردوں
سلکِ اختر میں مہِ نو، مژۂ گوہر بار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم، مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو، ترے حوصلے سے استظہار

مدح میں تیری نہاں، زمزمۂ نعتِ نبیؐ
جام سے تیرے عیاں، بادۂ جوشِ اسرار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ، یعنی تاثیر
یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار

مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ
خاکِ در کی ترے، جو چشم نہ ہو آئنہ دار

دشمنِ آلِ نبیؐ کو، بطرب خانۂ دہر
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو، طاقِ دیوار

دیدہ تا دل، اسدؔ، آئنۂ یک پرتوِ شوق
فیضِ معنی سے، خطِ ساغرِ راقم سرشار

(۲)

دہر، جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خودبیں؟

بیدلی ہائے تماشا، کہ نہ عبرت ہے، نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا، کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں

بَرزہ ہے، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — لغو ہے آئنۂ فرقِ جنون و تمکیں
نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت — سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے، چہ دُنیا و چہ دیں
مثلِ مضمونِ وفا، باد بدستِ تسلیم — صورتِ نقشِ قدم، خاک بفرقِ تمکیں
عشق، بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس — وصل، زنگارِ رُخِ آئنۂ حُسنِ یقیں
کوہکن، گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب — بے ستوں، آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں
کس نے دیکھا، نفسِ اہلِ وفا آتش خیز؟ — کس نے پایا، اثرِ نالۂ دلہائے حزیں
سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں، لیکن — نہ سرو برگِ ستایش، نہ دماغِ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ — یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں
نقشِ "لاحول" لکھ، اے خامۂ ہذیاں تحریر — "یا علیؑ" عرض کر، اے فطرتِ وسواس قریں
مظہرِ فیضِ خدا، جان و دلِ ختمِ رُسل — قبلۂ آلِ نبیؐ، کعبۂ ایجادِ یقیں
ہو، وہ سرمایۂ ایجاد، جہاں گرمِ خرام — ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں
جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا — وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں
نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے — اَبَداً، پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں
فیضِ خُلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا — بوئے گل سے، نفسِ بادِ صبا عطر آگیں
بُرشِ تیغ کا اُس کی، ہے جہاں میں چرچا — قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں
کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے — رنگِ عاشق کی طرح، رونقِ بتخانۂ چیں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! — وصیِ ختمِ رُسل تو ہے، بفتوائے یقیں
جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر — نامِ نامی کو ترے، ناصیۂ عرش نگیں
کس سے ممکن ہے مدح، بغیر از واجب؟ — شعلۂ شمع، مگر شمع پہ باندھے آئیں
آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ — رشتۂ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے، اسبابِ نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں، کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم، دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے، مداحیِ ممدوحِ خدا؟
کس سے ہو سکتی ہے، آرائشِ فردوسِ بریں

جنسِ بازارِ معاصی، اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب
ہے، ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

دے دعا کو میری وہ مرتبۂ حُسنِ قبُول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار "آمیں"

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو اُلفتِ دُلدُل میں، یہ سرگرمیِ شوق
کہ جہاں تک چلے، اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ اُلفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا، اثرِ شعلہ و دودِ دوزخ ؟
وقفِ احباب، گل و سنبلِ فردوسِ بریں

قصیدہ در مدح بہادر شاہ

(۳)

ہاں، مہِ نو، سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تُو، جُھک کے، کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تُو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا! اے سرورِ خاص خواص
حبّذا! اے نشاطِ عامِ عوام

عُذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے، عید کا پیغام

اُس کو بھُولا نہ چاہیے کہنا
صبح جو جاوے اور آوے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں
ایک ہی ہے امید گاہِ انام

مَیں نے مانا کہ تُو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا، مگر نہیں ہے غلام

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تُو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ
قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ رُوشناسی کا
جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، مَیں کون؟
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تُو انعام؟

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام؟

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص　　گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ　　کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام؟

جب کہ چودہ منازلِ فلکی　　ق　کر چکے قطع، تیری تیزیِ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر　　کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز　　اپنی صورت کا، اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا　　توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام　　تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام

مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں؟　　غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ہے　　کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

کعبے میں جا، بجائیں گے ناقوس　　اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

اس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد　　چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ وام

بوسہ دینے میں اُن کو ہے اِنکار　　دل کے لینے میں جن کو تھا اِبرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے　　کیوں رکھوں ورنہ، غالب اپنا نام

○

کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تُو کہہ　　اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام

کون ہے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زُہرہ و بہرام

تُو نہیں جانتا، تو مجھ سے سُن　　نامِ شاہنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل، بہادر شاہ　　مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام

شہ سوارِ طریقۂ انصاف　　نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیِ الہام
بزم میں میزبانِ قیصر و جم — رزم میں اوستادِ رستم و سام
اے ترا لطفِ زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام
چشمِ بد دُور! خسروانہ شکوہ — لَوحَشَ اللہ! عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم — جرعہ خواروں میں تیرے مُرشدِ جام
وارثِ مُلک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام
زورِ بازُو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا! موشگافیِ ناوک — ق — آفریں! آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے، تیرِ غیبِ ہدف — تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا، دم بند — ق — برق کو دے رہا ہے کیا اِلزام
تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا — تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرام
فنِ صورت گری میں تیرا گرز — ق — گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام
اُس کے مضروب کے سر و تن سے — کیوں نمایاں ہو صُورتِ ادغام؟
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایّام
اور اُن اَوراق میں بکلکِ قضا — مجملاً مندرج ہوئے احکام
لِکھ دیا شاہدوں کو "عاشق کُش" — لِکھ دیا عاشقوں کو "دشمن کام"
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں: — "گنبدِ تیز گردِ نیلی فام"
حکمِ ناطق لِکھا گیا کہ لِکھیں: — خال کو "دانہ" اور زلف کو "دام"
آتش و آب و باد و خاک نے لی — وضعِ سوز و نم و رم و آرام
مہرِ رخشاں کا نام "خسرو روز" — ماہِ تاباں کا اسم "شحنۂ شام"
تیرے توقیعِ سلطنت کو بھی — دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے، بموجبِ حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائی آغاز
ہو اَبد تک رسائی اَنجام

(۴)

صبحدم، دروازۂ خاوَر کُھلا
مہرِ عالم تاب کا منظر کُھلا

خسروِ انجم کے، آیا، صرف میں
شب کو تھا، گنجینۂ گوہر کُھلا

وہ بھی تھی اِک سِیمیا کی سی نمُود
صبح کو رازِ مہ و اختر کُھلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا، یہ بازی گر، کُھلا

سطحِ گردُوں پر پڑا تھا، رات کو
موتیوں کا، ہر طرف، زیور کُھلا

صبح آیا، جانبِ مشرق نظر
اِک نگارِ آتشیں رُخ، سر کُھلا

تھی نظر بندی، کیا جب رَدِّ سحر
بادۂ گُل رنگ کا ساغر کُھلا

لا کے ساقی نے، صبُوحی کے لیے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کُھلا

بزمِ سُلطانی ہُوئی آراستہ
کعبۂ امن و اَماں کا در کُھلا

تاجِ زرّیں، مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنہ پر کُھلا

شاہِ روشن دل، بہادر شہ کہ ہے
رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کُھلا

وہ کہ جس کی صُورتِ تکوین میں
مقصدِ نُہ چرخ و ہفت اختر کُھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کُھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کُھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کُھلا

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ق
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کُھلا

نقشِ پا کی صُورتیں وہ دلفریب
تُو کہے، بُت خانۂ آذر کُھلا

مجھ پہ، فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھُلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِّ وسع سے باہر کھُلا
تھا دلِ وابستہ، قفلِ بے کلید — کِس نے کھولا؟ کب کھُلا؟ کیونکر کھُلا؟
باغِ معنی کی دکھاؤں گا، بہار — مجھ سے گر، شاہِ سخن گستر کھُلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھُلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں، یُوں پر کھُلا — کاشکے ہوتا قفس کا در کھُلا
ہم پکاریں اور کھُلے، یوں کون جائے؟ — یار کا دروازہ پاویں گر کھُلا
ہم کو ہے اِس راز داری پر گھمنڈ — دوست کا، ہے راز دشمن پر کھُلا
واقعی، دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم، لیکن، داغ سے بہتر کھُلا
ہاتھ سے رکھ دی، کب ابرُو نے کماں؟ — کب کمر سے غمزے کی خنجر کھُلا؟
مفت کا کس کو بُرا ہے، بذرقہ — رہروی میں، پردۂ رہبر کھُلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک؟ — آگ بھڑکی، مینہ سے گر دم بھر کھُلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھُلا
دیکھیو، غالب سے گر اُلجھا کوئی — ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

○

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھُلا
خامے سے پائی، طبیعت نے، مدد — بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر، کھُلا
مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھُلا
مہر کانپا، چرخ چکّر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھُلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب عُلُوِّ پایۂ منبر کھُلا؟
سکۂ شہ کا، ہوا ہے، رُوشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھُلا

شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ   اب مآلِ سعیِ اسکندر کھُلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے   اب، فریبِ طغرل و سنجر کھُلا

ہو سکے کیا مدح ؟ ہاں، اِک نام ہے   دفترِ مدحِ جہاں داور کھُلا

فکر اچھی، پر ستایش ناتمام   عجزِ اعجازِ ستایش گر کھُلا

جانتا ہوں، ہے خطِ لوحِ ازل   تم پہ اے خاقانِ نام آور کھُلا

تم کرو صاحبقرانی، جب تلک   ہے طلسمِ روز و شب کا دَر کھُلا

قصیدہ در مدح نواب کلب علیخاں بہادر

(۵)

مرحبا! سال فرّخی آئیں — عیدِ شوّال و ماہِ فرودِ دیں
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار — مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نو روز — لیک بیش از سہ ہفتہ بُعد نہیں
سوٗ اس اکیس دن میں، ہولی کی — جابجا، مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں، کوٗبکوٗ، عبیر و گلال — باغ میں سُوبسُو، گُل و نسریں
شہر، گویا نمونۂ گلزار — باغ، گویا نگارخانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب — جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں — منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحّتِ نوّاب — رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزم گہ میں، امیر شاہ نشاں — رزم گہ میں، حریفِ شیرِ کمیں
پیش گاہِ حضورِ شوکت و جاہ — خیر خواہِ جنابِ دولت و دیں
جن کی مسند کا آسماں، گوشہ — جن کی خاتم کا آفتاب، نگیں
جن کی دیوارِ قصر کے نیچے — آسماں ہے گدائے سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور — نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں
انجمیں چرخ، گوہر آگیں فرش — نور ے، ماہ ساغرِ سیمیں
راجہ اِندر کا جو اکھاڑا ہے — ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ، نظرگاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ ضیابخشِ چشمِ اہلِ یقیں

واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم — کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے — ژالہ آسا بچھے ہیں دُرِّ ثمیں
نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا — جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں
اُس اکھاڑے میں جو کہ ہے منظوں — یاں وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں
سرورِ مہر فر، ہوا جو سوار — ق — بکمالِ تجمّل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن — اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقشِ سمِّ سمند سے، یکسر — بن گیا دشت، دامنِ گلچیں
فوج کی گردِ راہ، مشک فشاں — رہرووں کے مشام، عطر آگیں
بسکہ بخشی ہے فوج کو عزّت — فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
موکبِ خاص، یوں زمیں پر تھا — جس طرح ہو سپہر پہ پرویں
چھوڑ دیتا تھا گور کو، بہرام — ق — ران پر داغِ تازہ دے کے وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا — خاص بہرام کا ہے زیبِ سُریں
بندہ پرور، ثنا طرازی سے — مدّعا، عرضِ فنِ شعر نہیں
آپ کی مدح اور میرا منہ — گر کہوں بھی، تو آئے کس کو یقیں
اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے — ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و نیستی، خدا کی پناہ — دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا — ہے قلم کی جو سجدہ ریز جبیں
مدح گستر نہیں، دُعا گو ہے — غالبِ عاجزِ نیاز آگیں
ہے دُعا بھی یہی کہ دنیا میں — تم رہو زندہ جاوداں، آمیں

قصیدہ در مدح راجا شیودان سنگھ والیِ الور

(۶)

گنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ

گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بروزِ شمار
ہوا کرے گی ہر اک سال پیش کار گرہ

یقین جان، برس گانٹھ کا جو ہے تاگا
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بیشمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ پڑے؟
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ، کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ "دیکھ کتنی، اٹھالائے گا یہ تار، گرہ"؟

کہا کہ "چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے، تو پاویں گے نو ہزار گرہ"

خود آسماں ہے مہاراؤ راجہ پر صدقے
کرے گا سینکڑوں، اس تار پر نثار گرہ

وہ راؤ راجہ بہادر کہ حکم سے جن کے
رواں ہو تار پہ فی الفور دانہ وار، گرہ

اُنہیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی، نو بہار، گرہ

اُنہیں کی سال گرہ کے لیے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار، گرہ

اُنہیں کی سال گرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں، گہر ہائے شاہوار گرہ

اُنہیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں، ثمر ہائے شاخسار گرہ

سُن اے ندیم، برس گانٹھ کے یہ، تاگے نے
تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار گرہ

پئے دعائے بقائے جنابِ فیض مآب
لگے گی اس میں، ثوابت کی اُستوار گرہ

ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے یہی
بلا مُبالغہ، درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خُدا نے یہ جاذبہ اُس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتۂ زنہار گرہ

کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں جب اس زمانے میں
بچے نہ از پئے بندِ نقابِ یار، گرہ

متاعِ عیش کا ہے، قافلہ چلا آتا
خدا نے دی ہے وہ غالبؔ کو دستگاہِ سخن
کہاں مجالِ سخن؟ سانس لے نہیں سکتا
گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات
کھلے یہ گانٹھ، تو البتہ دم نکل جاوے
اِدھر نہ ہوگی توجہ حضور کی جب تک
دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں از رہِ بغض
دل اُسکا پھوڑ کے نکلے، بشکلِ پھوڑے کی

کہ جادہ رشتہ ہے اور ہے شُتُر قطار، گرہ
کرُوڑ ڈھونڈ کے لاتا ہے خاکسار، گرہ
پڑی ہے دل میں مرے غم کی بیحساب گرہ
زباں تک آکے، ہوئی ہے گلے کا ہار، گرہ
بُری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ہار، گرہ
کبھی کسی سے کھُلے گی نہ زینہار، گرہ
پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار گرہ
خدا کرے کہ کرے اس طرح اُبھار گرہ

قصیدہ در مدح نواب میکلوڈ بہادر

(۷)

کرتا ہے "چرخ" روز بصد گونہ احترام ۔۔۔ فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام

حق گوئے و حق پرست و حق اندیش و حق شناس ۔۔۔ نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام

جسم رُتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم ۔۔۔ تُرکِ فلک کے ہاتھ سے، وہ چھین لیں حُسام

جس بزم میں کہ ہو اُنہیں آہنگِ میکشی ۔۔۔ واں، آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام

چاہا تھا میں نے، تم کو مہِ چاردہ کہوں ۔۔۔ ق دل نے کہا کہ "یہ بھی ہے تیرا خیال خام

دو رات میں تمام ہے، ہنگامہ ماہ کا ۔۔۔ حضرت کا عزّ و جاہ رہے گا علَی الدّوام"

سچ ہے تم آفتاب ہو، جس کے فروغ سے ۔۔۔ دریائے نُور ہے، فلک آبگینہ فام

میری سُنو، کہ آج تم اس سرزمین پر ۔۔۔ حق کے تفضّلات سے، ہو مرجعِ اَنام

اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی ۔۔۔ تحریر ایک جس سے ہوا، بندہ تلخ کام

ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے تحریر کو، جگر ۔۔۔ کاتب کی آستین ہے، مگر، تیغ کا نیام

وہ فرد، جس میں نام ہے میرا غلط لکھا ۔۔۔ جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام

سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ یک قلم ۔۔۔ نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

ستّر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز ۔۔۔ جس نے، جلا کے، راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ، تیرھویں ۔۔۔ اِستادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام

اُس بزمِ پُرفروغ میں، اس تیرہ بخت کو ۔۔۔ نمبر ملا نشیب میں، از روئے اہتمام

سمجھا اُسے گر اب، ہوا پاش پاش، دل ۔۔۔ دربار میں جو، مجھ پہ چلی، چشمکِ عوام

عزت پہ اہلِ نام کی ہستی کی، ہے، بنا ۔۔۔ عزت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر — اُس ناز کا، فلک نے لیا مجھ سے، انتقام

آیا تھا وقت ریل کے کھلنے کا بھی، قریب — تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اِزدحام

اس کشمکش میں آپ کا مداح دردمند — آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو واں نہ کہہ سکا، وہ لکھا ہے حضور کو — دیں آپ میری داد، کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں — سلطانِ بر و بحر کے دَر کا ہوں میں، غلام

وکٹوریہ کا، دہر میں جو، مدح خوان ہو — شاہانِ عصر، چاہیئے لیں عزت اس سے وام

خود، ہے تدارک اُس کا، گورنمنٹ کو ضرور — بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جسکا نام

امرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال — بارے قدیم قاعدے کا، چاہیئے قیام

ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو — چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے، قدیم سے — یعنی، دُعا پہ مدح کا، کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دُعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے — اقلیمِ ہند و سندھ سے تا مُلکِ روم و شام

مثنویات

مثنوی در صفتِ انبہ

(۱)

ہاں، دلِ درد مند زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

خامے کا صفحے پر رواں ہونا — شاخِ گُل کا ہے گُل فشاں ہونا

مجُھ سے کیا پُوچھتا ہے، کیا لکھیے؟ — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رُطب فشاں ہو جائے

آم کا، کون، مردِ میداں ہے؟ — ثمر و شاخ، گوئے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟ — آئے، یہ گوئے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جاوے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے، تاک

نہ چلا، جب کسی طرح، مقدُور — بادۂ ناب بن گیا، انگُور

یہ بھی ناچار، جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پُوچھو، تمھیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے؟

نہ گُل اُس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار — جب خزاں آئے، تب ہو اُس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں؟ — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟

جان میں ہوتی، گر، یہ شیرینی ق — کوہ کن، باوجود غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یُوں مجھے یہ ثمر ق
کہ دوا خانۂ ازل میں، مگر

آتشِ گُل پہ قند کا ہے قِوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے

انگبیں کے، بحکمِ ربُّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

یا لگا کر خضر[۲] نے شاخِ نبات
مدّتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں، یہ نخل
ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر ایک، خسرو پاس ق
رنگ کا زرد پر کہاں بُو باس

آم کو دیکھتا اگر یک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دُودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خُلد کا توشہ
طُوبیٰ و سِدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم
ناز پروردۂ بہار ہے آم

خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو
نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایت عہد
عدل سے اُس کے، ہے حمایتِ عہد

فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہِ جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا، ہُما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے

اے مُفیضِ وجُودِ سایہ و نُور
جب تلک ہے نمُودِ سایہ و نُور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

مثنوی پتنگ

(۲)

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی — لے کے، دل، سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اِس قدر بگڑا کہ سَر کھانے لگا
میں کہا: "اے دل، ہوائے دلبراں — بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
پیچ میں ان کے نہ آنا، زینہار — یہ نہیں ہیں گے کسی کے یارِ غار
گورے پنڈے پر نہ اُن کے کر نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سُلجھانا تجھے — قہر ہے دل ان سے اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو اُڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سُن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب — غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب
"رشتہ در گردنم افگندہ دوست — می بُرد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

قطعات

قطعہ در مدح بہادر شاہ

(۱)

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانو سے تیرے مَلے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے، عالم پہ کُھلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے، دُنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بسُخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ — بکرم، داغ نہِ ناصیۂ قُلزُم و نیل

ق تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توقیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و اَلم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثَور سے جانا باہر — زُہرہ نے ترک کیا حُوت سے کرنا تحویل

تیری دانش، مری اصلاحِ مفاسد کی رَہین — تیری بخشش، مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ تَرحّم، مِرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل، مِرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اَماں — ق چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے، سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے، بُنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم — کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی — غمِ گیتی سے مرا سینہ، عمَر کی زنبیل

فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری، رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدّق، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی میری حالت، تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی میری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۲)

اے شہنشاہِ آسماں اَورنگ
اے جہاں دارِ آفتاب آثار

تھا میں اِک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اِک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی میری وہ گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
رُوشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ، از روئے ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں، کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مُرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے، یہ عریضہ نگار

بارے، نوکر بھی ہو گیا، صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مُشخّص، چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟
مدّعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں،
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیے، آخر
تا نہ دے، بادِ زمہریر، آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش؟
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے، اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے، اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک اِنساں — دھوپ کھاوے کہاں تلک جاں دار
دھوپ کی تابِش، آگ کی گرمی — وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار
میری تنخواہ جو مقرّر ہے — اُس کے مِلنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے، مُردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا، ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض — اور رہتی ہے سُود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریکِ ساہوکار
آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سُنیئے — ہے، زباں میری، تیغِ جوہر دار
بزم کا اِلتزام گر کیجے! — ہے، قلم میری، ابرِ گوہر بار
ظلم ہے، گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا؟ — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار؟
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو، مجھ کو زندگی دُشوار
ختم کرتا ہوں اب دُعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سرکار
تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۳)

اے شاہِ جہانگیر، جہاں بخش، جہاں دار — ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشِش سے نہ ہو وا — تُو وا کرے اُس عقدے کو، سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے، کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟ — گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا — ہے فخرِ سلیماں، جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا، فرمانِ الٰہی — ہے داغِ غلامی ترا، توقیعِ امارت
تُو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں ق — تُو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈے نہ ملے، موجۂ دریا میں رَوانی — باقی نہ رہے، آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے، گرچہ، مجھے نکتہ سرائی میں تَوَغُّل — ہے، گرچہ، مجھے سحر طرازی میں، مہارت
کیوں کر نہ کروں مدح کو مَیں ختم دُعا پر؟ — قاصر ہے، ستایش میں تری، میری عبارت
نَو روز ہے آج، اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں — نظّارگیِ صنعتِ حق، اہلِ بصارت
تجھ کو، شرفِ مہرِ جہاں تاب مُبارک! — غالب کو، ترے عتبۂ عالی کی زیارت

سہرا شہزادہ جواں بخت

(۴)

خوش ہو، اے بخت، کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ، شہزادہ جواں بخت کے سر پر، سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے — ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور، سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے، پر اے طرفِ کلاہ — مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر، سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی — ورنہ، کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا؟
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رُخ پہ دُولھا کے جو گرمی سے، پسینہ ٹپکا — ہے رگِ ابرِ گہر بار، سراسر، سہرا
یہ بھی اک بے اَدبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے — رہ گیا آن کے دامن کے برابر، سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرّر، سہرا
جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے — گوندھے پھولوں کا، بھلا پھر کوئی کیونکر، سہرا؟

رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک — کیوں نہ کھلاوے فروغِ مہ و اختر سہرا؟
تارِ ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار — لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا؟
ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرف دار نہیں — دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا؟

معذرت

(۵)

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ، شاعری، ذریعۂ عزّت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نُما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
مَیں کون اور ریختہ؟ ہاں اِس سے مدّعا — جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ اَمر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصُود اُس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو، تو رُوسیاہ — سَودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں، غالبؔ خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح بتقریبِ نیاز ماہِ صفر

(۶)

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر، چلو ——— رکھ دیں چمن میں، بھر کے مئے مشکبو کی ناند
جو آئے، جام بھر کے پیے، اور ہو کے مست ——— سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند
غالب، یہ کیا بیاں ہے؟ بجز مدحِ بادشاہ ——— بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں ——— ہے جن کے آگے سیم و زر، مہر و ماہ، ماند
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے ——— لاکھوں ہی آفتاب ہیں، اور بے شمار چاند

عذرِ صوم

(۷)

افطارِ صوم کی کچھ، اگر، دستگاہ ہو ——— اُس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ——— روزہ اگر نہ کھائے، تو ناچار کیا کرے

عُذرِ عدمِ حاضری دربار

(۸)

سہل تھا مُسہل، ولے یہ سخت مشکل آپڑی ——— مجھ پہ کیا گزرے گی، اتنے روز حاضر بن ہوئے؟
تین دن مُسہل سے پہلے، تین دن مُسہل کے بعد ——— تین مُسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے؟

شکریہ بیسنی روٹی

(۹)

نہ پُوچھ اس کی حقیقت، حضورِ والا نے ۔۔۔ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خُلد سے باہر ۔۔۔ جو کھاتے حضرتِ آدمؑ یہ بیسنی روٹی

شکوہ سلام دربار

(۱۰)

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں ۔۔۔ دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام ۔۔۔ اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

قطعہ در مدح نصرت الملک بہادر

(۱۱)

نُصرتُ الملک بہادر، مجھے بتلا کہ مجھے ۔۔۔ تجھ سے جو اتنی ارادت ہے، تو کس بات سے ہے
گرچہ تُو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے ۔۔۔ رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور مَیں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں ۔۔۔ غیر کیا، خود مجھے نفرت مِری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست ۔۔۔ نسبت اِک گونہ مرے دل کو ترے ہاتھ سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں ۔۔۔ یہ دُعا شام و سحر، قاضیِ حاجات سے ہے
تُو سکندر ہے، مرا فخر ہے مِلنا تیرا ۔۔۔ گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
اِس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار ۔۔۔ غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

قطعہ تاریخ شادی میرزا جعفر

(۱۲)

خجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر　　کہ جسکے دیکھے سے، سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں، غالبؔ　　نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی "محظوظ"؟
۱۸۵۴ء

(۱۳)

ہوئی ہے جب میرزا جعفر کی شادی　　ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے: "تاریخ اسکی کیا ہے"　　تو بولا: "انشراحِ جشنِ جمشید"
۱۲۷۰ھ

سہرا

(۱۴)

چرخ تک دھوم ہے، کس دھوم سے آیا سہرا　　چاند کا دائرہ لے، زُہرہ نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں، آپس میں اُلجھ کر لڑیاں　　باندھنے کے لیے جب سر پہ اُٹھایا سہرا

سہرا شہاب الدین خاں

(۱۵)

ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں　　بزمِ شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو　　ہے تو کشتی میں، ولے بحرِ رواں ہے سہرا

چکنی ڈلی

(۱۶)

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچھا کہیے

خامۂ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ، سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مِسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے

حجرُ الاسوَدِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ، آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اُس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صَومَعے میں اسے ٹھہرایئے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبّت لکھیے؟
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنّا کہیے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصوّر کیجے؟
کیوں اسے مردُمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے؟
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سُپاری کو سویدا کہیے

یادگارِ کلکتّہ

(۱۷)

کلکتے کا جو ذکر کیا تُونے ہم نشیں
اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب — وہ نازنین بُتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر — طاقت رُبا وہ اُن کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ! — وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے

تجدیدِ اُلفت

(۱۸)

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری — کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ — قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں: "کیوں؟ ہم نہ کہتے تھے"

شکوۂ بخت

(۱۹)

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی، فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا، شریکِ غالب ہے

شہر آشوب

(۲۰)

بسکہ فعّالِ ما یُرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ، ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے — گھر، بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی، واں نہ جا سکے، یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

(۲۱)

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس — یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر، کہا صیاد نے: — "یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب"

شاعر کا دِل

(۲۲)

اُٹھا اِک دن بگولا سا جو کچھ میں، جوشِ وحشت میں — پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے
نظر آیا مجھے اِک طائرِ مجروح پر بستہ — ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ "او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے؟ — پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا — تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا: "میں صید ہوں اُس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں — پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اُسی کے زلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو — نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا — کہ جل کر، ہو گیا یوں خاک، میری آہِ سوزاں سے

مرثیہ

(۲۳)

ہاں، اے نفسِ بادِ سحر، شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں، چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم، لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو؟
بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے، محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نُہ پایہ جو مدّت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رُتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم ہے، دل و چشم و زباں کا — کچھ اور ہی نقشا نظر آتا ہے، جہاں کا
کیسا فلک، اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا — ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں، اس رُو سے کہ وُہ برق نہیں ہے

رُباعیات

طرزِ غالبؔ

(۱)

مشکل ہے، زبس، کلام میرا' اے دل سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی، کرتے ہیں فرمائش "گویم مشکل، وگرنہ گویم مشکل"

آرزوئے اِعادۂ شباب

(۲)

بعد از اتمامِ بزمِ عیدِ اطفال ایامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم اے عمرِ گزشتہ، یک قدم استقبال

جوشِ گریہ

(۳)

شبِ زلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا کیا شرح کروں ہم کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ہر قطرۂ اشک، دیدۂ پُر نم تھا

حسرتِ دیدار

(۴)

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی
بے تابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلی، افسوس!
تکرار رَوا نہیں، تو تجدید سہی

بغض و حسد

(۵)

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لیے
یعنی، ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لیے

جورِ بُتاں

(۶)

آتشبازی ہے جیسے شُغلِ اطفال
ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی
لڑکوں کے لیے گیا ہے کیا کھیل نکال

لذّتِ آزار

(۷)

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے، غالبؔ
دل، رُک رُک کر بند ہو گیا ہے، غالبؔ
واللہ، کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا، سوگند ہو گیا ہے، غالبؔ

دَرماندگی

(۸)

دل، سخت نژند ہوگیا ہے، گویا — اُس سے گلہ مند ہوگیا ہے، گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں — غالب، مُنہ بند ہوگیا ہے، گویا

سِتم ظریفی

(۹)

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں — عشّاق کی پُرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظُلم سے اُٹھایا ہوگا — کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

مدح بہادر شاہ

(۱۰)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم — آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم — ہے اب کے شبِ قدر و دوالی باہم

دُعا بحق بہادر شاہ

(۱۱)

حق، شہ کی بقا سے، خلق کو شاد کرے — تا شاہ، شیوعِ دانش و داد کرے
یہ، دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ — ہے صفر کہ افزایشِ اعداد کرے

دعا بحقِ بہادر شاہ

(۱۲)

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا — اتنے ہی برس شمار ہوں، بلکہ سوا
ہر سینکڑے کو ایک گرہ فرض کریں — ایسی گرہیں ہزار ہوں، بلکہ سوا

شکریہ تحفۂ دال

(۱۳)

بھیجی ہے جو، مجھ کو شاہِ جمجاہ نے دال — ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال، بے بحث و جدال — ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

شکریہ تخمِ سیم

(۱۴)

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے؟ — بھیجے ہیں جو ارمغاں، شہِ والا نے
گن کے دیویں گے ہم دعائیں سو بار — فیروزے کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

عذرِ صوم

(۱۵)

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں؟ — آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟
روزہ مرا ایمان ہے، غالب، لیکن — خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟

شکوۂ حق

(۱۶)

ہم گر چہ بنے سلام کرنے والے — کرتے ہیں درنگ، کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں "خدا سے" اللہ اللہ! — وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

شکوۂ جواب

(۱۷)

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے؟ — ثاقب، حرکت یہ کی ہے بیجا تم نے
حاجی کلو کو دے کے بے وجہ جواب — غالب، کا پکا کلیجا تم نے

پرسشِ احوال

(۱۸)

اے روشنیِ دیدہ شہاب الدیں خاں — کٹتا ہے بتاؤ کس طرح سے رمضاں؟
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک؟ — سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں؟

غالب کا مسلک

(۱۹)

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری — کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری"
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی؟ — شیعی کیونکر ہو، ماوراءالنہری

خاتمہ

سفینہ ختم ہوا اور مدح باقی ہے
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

خاتمہ

فکروفن کے جتنے گوشے روشن ہوتے جاتے ہیں، اسی رفتار سے فنکار اُبھرتے یا ڈُوبتے جاتے ہیں۔ مصوّری اور شاعری کی حد تک آیئے تو اس دُنیائے رنگ و آہنگ میں ہزاروں فنکار قطار در قطار ملتے ہیں مگر نگاہ فن آشنا کے انتخاب میں دو چار ہی آتے ہیں۔ مصوّری میں تو یہ ہوا کہ اُسے خواص کا فن مانا گیا، نہ کسی ایک مصوّر کے نقش یک جا ہو کر زینت کاشانہ ہوئے نہ عوام کو اُن کے نام و نشان یاد ہیں۔ بہزاد کا نام بھی ہے کام بھی مگر ہنر پروروں نے آج تک اس کا البم جمع کر کے سب کو فیض یاب نہ کیا۔ دُور کیوں جایئے خود آج کے استادوں میں عبدالرحمٰن چغتائی، اُستاد اللہ بخش اور محمد عسکری جیسے مشاہیرِ فن میں کس کا دفترِ نقش و نگار مدوّن طور پر ایک کتاب میں موجود ہے؟ مغرب کے مصوروں اور مشرق کے چابکدست نقاشوں کے متفرقات کو اگر جمع بھی کیا گیا ہے تو اس کا حصول بھی ہر شخص کی دسترس میں نہیں۔ لہٰذا ان پر بحث و نظر میں وہ کاوش و ہمہ گیری بھی نہیں جو دفترِ شعر و سخن کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعر گوئی، شعر فہمی، شعر شناسی اور تنقیدِ شعر فنون کی حدود سے نکل کر علم اور علم بھی وہ جس کی گہرائی اور کناروں کا معلوم ہونا دُشوار ہو چکا ہے۔

نقش و نگار کا عمل کمسن بچے سے پختہ مزاج جوان اور کسی حد تک بوڑھوں کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کے باوجود نقوش شناسی کا جذبہ ہر ایک میں نہیں ہے۔ بخلافِ شعر، شعر گوئی کی تڑپ ہر دل میں ہے، گنگنانا ہر فطرت میں ہے اور اس پر کان دھرنا اور دھیان دینا بھی قہری

عمل ہے۔ یوں سمجھیے کہ تصویر و نقش کی تاثیر اتنی گہری نہیں کہ ہر درجہ کا انسان شدید طور پر متاثر ہوکر اسے حرزِ جان و تعویذِ بازو بنالے، اسے دیکھے دکھائے، اس سے مسرت والم کا بھرپور اثر لے، بے لطف ہوکر نفرین یا لذت اندوز ہوکر بے ساختہ بیخ اُٹھے ـــــ شعر کی یہ حالت ہے کہ سُن کر سرُور طاری ہونا، بے چین ہوکر تحسین و نفرین کا اظہار ایک عام بات ہے۔ پسندیدہ تصویر سے تاثر کا اظہار اصل تصویر کے اعادے سے ممکن نہیں مگر شعر کی اچھائی یا بُرائی خود شعر کی تکرار سے ظاہر کی جاسکتی ہے، اس لیے شعر سب کے لیے ہے۔ تصویر سب کے لیے نہیں ہے۔ تصویر نقش و رنگ کا پیراہن ہے اور کاغذ کی قیدی، شعر دیوان میں مقیّد ہوتے ہوئے بھی فضائے صوت و سماعت میں پرفشاں بھی ہوسکتا ہے۔ وہ بیک وقت قیدی بھی ہے، اور آزاد بھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ 'نقش' کی تاثیر صرف نظر کے ذریعے ہے۔ شعر، ناطقہ و سامعہ و باصرہ تین وسیلوں سے اثر کرتا ہے۔ تصویر دیکھیے تو اثر ہوگا، شعر، پڑھیے، سُنیے اور دیکھیے تو جادُو کرے گا۔ تصویروں سے بادشاہوں کے شبستان آراستہ ہوتے ہیں 'امیروں' کے محل دل کش بنتے ہیں۔ شعر درباروں کی رونق اور جھونپڑوں کی آبادی اور چہل پہل کا باعث ہیں۔ تصویر، دولت چاہتی ہے اور شعر غُربت کا ساتھ دے جاتا ہے۔ اچھی تصویر کہنگی کا شکار ہوجاتی ہے، اچھا شعر ہر وقت نیا رہتا ہے۔ شعر زندگی میں گرمی، شعُور میں توانائی اور نظر میں گہرائی، دانش و فرہنگ کو امداد دیتا ہے۔ تھکا ہوا مزدُور شعر سُن کر تھکن دُور کرتا ہے، امیر شعر پڑھ کر غمِ روزگار کا مداوا کرتا ہے، مفکر اس سے ذہن کو جلا بخشتا ہے، لیڈر اس سے قوم کی قوتوں کو بیدار کرتا ہے، استاد اس کے سہارے فلسفہ و تاریخ کے سبق دیتا ہے، ماہرِ نفسیات اس کے ذریعے شعُور و لاشعُور کی گتھیاں حل کرتا ہے۔

غرض تاریخ و سائنس، تمدن و معاشرت، روزمرہ کی سادہ باتیں اور عوام و خواص کے اہم مسائل میں شعر کا سب سے زیادہ دخل ہے۔ اَدب و فن، فکر و نظر، علم و عمل کی دُنیا میں جوش و خروش، مسرت والم، پیش قدمی و پسپائی، جنگ و امن میں شعر کی قوت کا اندازہ آج کی

تحقیق نہیں ہمیشہ سے فلسفی اور سپاہی اس کا اعلان کرتے رہے ہیں۔ شعر کا تعلق شمشیر و سناں سے بھی ہے اور طاؤس و رباب سے بھی ہے۔

غالب کا شعر، اُردو ادب میں سب سے بلند مرتبہ کا حامل ہے، اس میں نقش و تصویر کے اوصاف بھی ہیں اور مجسّمہ اور موسیقی کی کرشمہ آفرینی بھی ہے۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ غالب کا شعر زندگی کے جتنے مرحلوں میں کام آتا ہے، شاید ہی کسی کا شعر اس قدر کام آتا ہو، یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب چھ آنے کی قوتِ خرید رکھنے والے سے چھ روپے اور ساٹھ روپے تک کا خریدار حاصل کرتا ہے۔ پھر لطف بالائے لطف یہ ہے کہ دیوان کے ساتھ خود غالب بھی ہاتھ آتا ہے:

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

دیوان غالب، ایک طرف ذوق خریدار کا معیار معیّن کرتا ہے اور اسی کے ساتھ متاعِ سخن کا وہ سرمایہ مہیّا کرتا ہے جس میں خود غالب اپنی رنگا رنگ الجھنوں، پیچ در پیچ افکار و مصائب کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ زندگی کی شادکامیاں، تمنّاؤں کی سسکیاں، حسرتوں کی گھٹن اور عشرتوں کے قہقہے ہیں۔ فکر کے نئے اور زندہ رجحان، عمل کا متحرک نشاط، مسرتوں سے عبرت، عبرتوں پر تفکر، عام انسان کا دل، نظامِ معاشرت و قوانین فطرت کی عکاسی ہے۔ پھران پر طنز و تمسخر ہے، تجربوں کا خلاصہ ہے اور اُن کا مختلف پہلوؤں سے عمل اور ردِّ عمل کا تجزیہ ہے۔ بلند نگاہی، عالی ہمّتی، فراخ دلی اور خوش مذاقی کا حسین امتزاج قوسِ قزح کے رنگوں سے عکس قبول کرکے نکھر جاتا ہے۔ اس رنگین پردے میں خود غالب کا سراپا سامنے نظر آتا ہے۔ اس کا اُبھرا ہوا قد، میدہ شہاب رنگ، اُبھرے ہوئے خد و خال، مست آنکھیں، مسکراتے لب، گلابی رخسار، اس پر موزوں ڈاڑھی، چوڑی پیشانی، بلند گردن، چوڑا سینہ اور متناسب اعضا، ولایتی ڈیل ڈول، روایتی لہجہ، مگر گھمبیر آواز، زیرِلب مسکراہٹ اور شوخ و

ظریفانہ گفتگو بات میں بات پیدا کرنا۔ شکوہ ایسا کہ سُننے والا جواب نہ دے سکے۔ سوال ایسا کہ سوچنے والا تڑپ جائے، جواب وہ کہ صاحبِ ذوق پھڑک اُٹھے۔ دوسرے کے دل سے خیال، دوسرے کی زبان سے بول، دوسرے کی فکر سے نکتہ آفرینی چھین لینا غالبؔ کا خاصہ ہے۔ یہ سب باتیں ایسے خوب صورت انداز میں کہی ہیں کہ دیکھنے اور سُننے والا کہتا ہے :

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالبؔ عشق کا شاعر ہے مگر روایتی عشق کو زندگی کے معنے دیتا ہے۔ وہ زندگی کا ترجمان ہے مگر اُسے استعارہ قرار دیتا ہے۔ وہ غم نصیب ہے مگر دوسروں کو گُدگُداتا ہے۔ وہ ظریف الطبع ہے مگر دل کو گداز بخشتا ہے۔

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

حوصلہ کی وسعتوں اور دُنیا کی تنگیوں میں جو مسلسل تصادم اس نے دیکھے ہیں اُسے پُوری دیانت، صحت اور احتیاط سے بیان کرتا ہے۔ ابلاغ، افہام، ترجمانی، بصیرت آفرینی اس کا کرشمہ ہے۔ وہ ہر سطح کی بات کرتا ہے مگر خود بلند مرتبہ ہے۔ یہی بلندی مرتبہ اس کا معیارِ فنی ہے اور اس کے شعر میں اتنی عجیب پہلوداری پیدا کرتی ہے کہ اُردو شعر و غزل کا دفتر اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے :

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

لفظ و معنی کے متنوّع استعمال، ان کو نئے سے نئے پیرائے عطا کرنے کا جو ملکہ مرزا کو ہے اسی کا تجزیہ اور مطالعہ بتاتا ہے کہ دیوانِ غالبؔ پُرانی قدروں، ادب کی روایتی خوبیوں کے علاوہ مستقبل کی فکر اور آئندہ کے زندہ و تابناک فن کا آئینہ ہے۔ اُس نے شاعر کے

عظیم مقصد کی نشاندہی کی ہے۔ غزل کی وسعت کا اندازہ بتایا ہے۔ ایک خیال کو بار بار دُہرانے، کہی ہوئی بات کو مکرر کہنے کا نیا تجربہ پیش کیا ہے ــ آپ دیوانِ غالب کو مسلسل پڑھیے، یا جستہ جستہ، نشاطِ ذوق اور مسرتِ وجداں کی نو بہ نو لذتوں میں ڈوبتے جائیں گے۔ کیونکہ ہر بات دوسری مرتبہ نئے رنگ و آہنگ میں سُنائی دے گی۔ یہ رنگ فریبِ نظر نہیں، یہ آہنگ، گوش و قوتِ سماعت تک محدود نہیں بلکہ دل میں اُترتا اور فکر کو حرکت دیتا ہے ــ غالب کو شعوری طور پر اس بات کا احساس تھا:

شعرِ غالب نہ بُود وحی و نگوئیم، ولے
تو و یزداں، نتواں گفت کہ الہامے ہست

ڈاکٹر بجنوری کا مشہور عقیدہ اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ویدا اور دیوانِ غالب ــ ویدا کا حال تو معلوم نہیں، لیکن دیوانِ غالب کے بارے بہر حال یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اس میں ولائے شاعری چیزے دگر ضرور ہے ــ اس "چیزے دگر" کی دریافت ادب کا بہترین مشغلہ ہے۔ یہ دریافت وسعتوں سے آشنا اور روشنیوں سے منوّر کرتی ہے۔

مرتضیٰ حسین فاضل
(لکھنوی)

روشنی اور وسعت

گِلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گُہر میں محو ہُوا، اِضطراب دریا کا

مرتضیٰ حسین فاضل

عنوان

راہی اور مسافر

آئینہ

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے
یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

شکوہِ سنج رنج یک دیگر نہ رہنا چاہیے
میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

تا کہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینۂ تمثال دار تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا مُنہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے یک بال تپیدن پر

وصال، جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں؟
کہ دیجیے آئینۂ انتظار کو پرواز

نہ لیوے گر خسِ جوہر تراوت سبزۂ خط سے
لگاوے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہرِ آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو، شش جہت میں مقابل ہے آئینہ

اپنے کو دیکھتا نہیں، ذوقِ ستم تو دیکھ
آئینہ تا کہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد
دل سے اُٹھا لطف جلوہ ہائے معانی
مدّعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
غمِ عشّاق نہ ہو سادگی آموزِ بُتاں
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
اس چشمِ فسوں ساز کا گر پائے اشارہ
سیماب پشت گرمیِ آئینہ دے ہے ہم
حُسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعنِ بدعہدی
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
تمثال میں تیرے ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ
کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
پھرکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پہ آب
دل مت گنوا، خبر نہ سہی سیر ہی سہی
آئینہ کیوں نہ دُوں کہ تماشا کہیں جسے

خارِ پا ہیں، جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
غیرِ گل، آئینۂ بہار نہیں ہے
آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
آئینہ فرشِ ششش جہت انتظار ہے
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے
آئینہ، زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے
آئینہ بہ دستِ بتِ بدمست حنا ہے
آئینہ بہ اندازِ گل آغوش کشا ہے
تیغِ ستم، آئینۂ تصویر نما ہے
رحمت، کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے
اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے
اے بے دماغ، آئینہ تمثال دار ہے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

روزن و شعاع

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

نہ چھوڑی حضرتِ یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی حضرتِ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن، کہ رکھتا ہے
شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

ہوئے اس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پَرافشاں جوہر آئینہ میں مثلِ ذرہ روزن میں

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

بطوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

صحرا اور بیابان

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسُود تھا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھُلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلےٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

یاسِ اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
ذرّہ صحرا دست گاہ و قطرہ دریا آشنا

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجُود
ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

بے در و دیوار سا اِک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا
دریا، زمین کو عرقِ انفعال ہے

دست گاہِ دیدۂ خوں بارِ مجنوں دیکھنا
اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے مجنوں
ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ
ہے ذرّہ ذرّہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق
سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے

یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے
ہم بیابان میں ہیں گھر میں بہار آئی ہے
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے
گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ساحل اور طوفان

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تُو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مَیں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل
کھیل لڑکوں کا ہُوا دیدۂ بینا نہ ہُوا

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا
گہر میں محو ہُوا اضطراب دریا کا

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل
سیلابِ گریہ در پئے دیوار و در ہے آج

نہ پوچھ بےخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب
کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج
گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

خضر

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا — گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز — دُعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — مانا کہ اِک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مجنوں

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار — صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا — قیس تصویر کے پردے میں بھی عُریاں نکلا

مانعِ وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے — خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

فنا تعلیمِ درسِ بے خودی ہوں اُس زمانے سے — کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

قیامت ہے کہ سُن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا — تعجب سے وہ بولا، یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں؟

تم کو بھی ہم دکھائیں گے مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے — اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا — گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلےٰ مرے آگے

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر
کب تک خیالِ طرّۂ لیلیٰ کرے کوئی

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گذُر نہ کر
ہر ذرّہ کے نقاب میں دل بیقرار ہے

ہر یک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

فرہاد

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کر پیدا نہ ہووے آشنا؟

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ،
سرگشتۂ خمارِ رسُوم و قیوُد تھا

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو؟ کیا خوب!
ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہ رقیب
بے ستونِ آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات، کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے،

بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوُا
کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن تکیہ